بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

مطبوعات کتبخانہ محمد شریف عبدالغنی تاجران کتب لاہور بازار کشمیری

کا

سلسلہ نمبر (۲)

القول المتین

فی

تفسیر

سورۃ والتین

للامام الہمام احمد المکنی بابی الکلام آزاد

سلسلہ مصنفات امام الہند مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

محمد شریف عبدالغنی تاجران کتب کشمیری بازار لاہور در سنہ ۱۳۴۰ھ

۱ / ۱

یہ بھی اسی دیکھ مطبوعات اور کتب مصنفہ مولانا ابو الکلام آزاد کی کل فہرست ملاحظہ فرمائیں۔

تذکرہ

حضرت امام ابو الکلام آزاد کی اس وقت کی تصنیف جبکہ آپ رانچی میں نظربند
اس میں امام موصوف نے اپنے خاندان کے بعض اکابر و شیوخ کے حالات قلمبند کئے
جن لوگوں نے حضرت امام کے مضامین پڑھے ہیں وہ اس کتاب کی خوبی کا اندازہ اچھی طرح
سے لگا سکتے ہیں آپکی نہایت ہی زبردست تصنیف ہے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ یہ تحریر انسانی دماغ کے افکار کا نتیجہ نہیں بلکہ الہام ربانی ہے جو کہ عرش عظیم
سے براہ راست امام موصوف کے قلب پر نازل ہوا۔ اور پھر وہاں سے منتقل ہو کر
صفحات قرطاس پر ظاہر ہوا۔ نام کو تو آباؤ اجداد کا تذکرہ ہے لیکن در حقیقت یہ تحریر
اُس جذبۂ عشق و محبت سے لبریز ہے۔ جو حضرت امام کو "دعوت الی اللہ" کے منصب
جلیلہ سے ہے۔ آباؤ اجداد کے حالات کے ضمن میں جہاں ان کی حریت اور راہ حق
پر استقامت کا ذکر کرنا شروع کیا ہے تو اس موضوع کو اس قدر طول دیا ہے
کہ کتاب کی ساری ضخامت اسی میں کھپ گئی ہے۔ "دعوت الی اللہ" اور
"مقام عزیمت دعوت" کے مضامین کو نہایت شرح و بسط اور ہر ایک
پہلو سے واضح کیا ہے۔ "مقام عزیمت دعوت" کے سلسلے میں امام مالک بن انس،
احمد بن حنبل، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم، حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ، مولانا
اسماعیل شہید، حضرت شیخ احمد سرہندی اور دیگر ان بزرگوار ہستیوں کے واقعات
مفصل طور پر قلم بند کئے ہیں جن کی حیات طیبہ کا امتیاز خصوصی اسی دعوت الی اللہ
کا التزام اور اسی ہدی مستقیم کا اتباع تھا کتاب اس قابل ہے کہ بلاناغہ اور بار بار پڑھی جائے۔

التقریب

حامداً و مصلیاً

خوشی کا مقام ہے کہ خدا کے فضل سے آج کل عوام الناس میں بالعموم، اور انگریزی خواں اصحاب میں بالخصوص، قرآن حکیم کے فہم و درس کا شوق و ذوق دن بدن ترقی پر ہے۔ اس احساس فطری کا نتیجہ ہم اس طور پر دیکھ رہے ہیں کہ مختلف تفاسیر جلد جلد شایع ہو رہی ہیں۔ اس خیال سے متاثر ہو کر ہم بھی قارئین کرام کے سامنے قرآن حکیم کی ایک مختصر مگر نہایت ہی جامع اور پر مغز، سورۃ "والتین" کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔ تفسیر کی خوبی کے لئے اتنا کہنا بس کرتا ہے کہ یہ جناب امام الہند مولنٰا ابو الکلام آزاد کا زورِ قلم ہے۔ امام موصوف کے "ترجمان القرآن" اور تفسیر "البیان" کے طول طویل انتظار نے شائقین کے دلوں میں مایوسی پیدا کر دی ہے۔ آج، جبکہ یہ دونوں چیزیں ضبط ہو چکی ہیں، ان کا طباعت کے لئے واپس ملنا اور پبلک کے سامنے آنا غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ "ترجمان القرآن" اور "البیان" کی عدم موجودگی میں اگر امام موصوف کے وہ مضامین پڑھے جائیں، جو کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً قرآن حکیم کی بعض سورۃ یا

آیات متفرقہ کے ترجمہ اور تفسیر کے متعلق لکھے ہیں، تو شائقین کے لئے بہت مفید ہو سکتے ہیں۔ صرف ان مضامین کے دیکھنے سے بھی طبائع میں ایسا ملکہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مکمل تفسیر کے معانی کا اندازہ کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پاس اس قسم کا مواد کافی مقدار میں موجود ہے۔ سردست ہم "والتین" کی تفسیر پیش کرتے ہیں، اور یہ بات ظاہر کرنے کی بھی جرأت کرتے ہیں کہ سورہ "والتین" کی مقدار سے چالیس پچاس حصے زائد ہمارے پاس مواد موجود ہے۔ وہ زیر طبع ہے انشاء اللہ تھوڑے ہی عرصے میں چھپ جائیگا۔

امام صاحب کی تفسیر میں منجملہ اوصاف کے ایک بڑی بھاری خوبی یہ ہے کہ حدیث نبوی اور آثار صحابہ کے موافق ہوتی ہے۔ آج کل مختلف تفاسیر شایع ہو رہی ہیں۔ چونکہ طبائع جدت پسند ہیں، مصنفین نئے نئے افکار و آراسے کام لیتے ہیں۔ بخلاف اس کے امام صاحب کی تفسیر میں کسی مقام پر بھی حدیث و اثر سے انحراف نظر نہیں آتا۔ باوجود اس کے جو حسن اور خوبی ان کے معانی اور تراجم میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ انہی کا حصہ ہے۔ ہم نے قارئین کرام کے سامنے ایک ہی صورت کی دو مختلف تفسیریں پیش کی ہیں۔ پہلی تفسیر تو جناب مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی ایڈیٹر "الامان" نگینہ، کی طرف منسوب ہے دوسری تفسیر حضرت امام کی ہے۔ ہم نے تقابل کے لئے دونوں رکھ دی ہیں نکتہ شناس نگاہیں جانچ لینگی کہ پہلی تفسیر میں ربط معانی کی خاطر،

کس قدر تکلف سے کام لیا گیا ہے اور دوسری تفسیر میں مولانا نے کس طرح تکلف سے الگ ہو کر، محض حدیث و اثر کی بنا پر معانی کو منطبق کر کے ایک گلدستہ سا پیش کر دیا ہے۔ فی الواقع فن تفسیر میں یہ امر اہم ضروریات میں سے ہے کہ تفسیر کا ہر پہلو حدیث نبوی کی کسوٹی پر تلا اور جانچا ہوا ہو، جیسا کہ حضرت امام موصوف نے خود اسی سورت کی تفسیر میں صفحہ ۵۶ پر دوسری سطر میں اس بات کی تصریح کی ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ امام ابوالکلام آزاد نے دنیائے اسلام کے تین مقتدر اصحاب، یعنی امام ابن تیمیہؒ، حافظ ابن القیمؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مصنفات کو بہت پسند کیا ہے۔ زیادہ تر آپ کا علم ان ہی اصحاب ثلاثہ کی زریں تصانیف سے ماخوذ ہے، اور بلا شبہ، امت مرحومہ میں یہ تین بزرگوار ہستیاں ایسی ہیں کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ میں مجتہد مطلق تسلیم کی گئی ہیں۔ اسی تفسیر "والتین" کے صفحہ ۴۴ پر سطر میں امام موصوف نے پہلے دو اصحاب کی تعریف میں بہت کچھ لکھ دیا ہے اور مؤخر الذکر یعنی شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے متعلق امام صاحب کی رائے دوسرے مضامین میں پائی جا سکتی ہے۔ تعجب، اور تعجب کے ساتھ، حسرت ہے کہ جس قدر یہ کتابیں مفید ثابت ہوئی ہیں، اسی قدر ان کی اشاعت میں کوتاہی کی گئی ہے۔ ہم نے محض اللہ تعالیٰ کے سہارے، اس بات کا عزم کر لیا ہے کہ ان ائمہ ثلاثہ

کی وہ بے نظیر کتابیں جو گمنامی میں پڑی ہیں، پبلک کے سامنے لائیں، بہترین مصنفین سے ان کتابوں کے ترجمے کرائیں، اور اپنے کتب خانہ کی تجارت کو کو ان اصحاب ثلثہ، اور ان کے بہترین جانشین مجدد ملت امام ابوالکلام آزاد کی تصانیف کے ذریعے فروغ دے کر ثواب دارین حاصل کریں محض دنیاوی منفعت اگر متصور ہو تو اور کتابوں کے ذریعے سے بھی ہو سکتی ہے۔
ہمارا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ صحیح طور پر اشاعت علوم حقہ کے لئے مفید کتابیں تیار کرائیں اور یہ ظاہر ہے کہ ان ائمہ اربعہ کی تصانیف سے بڑھ کر اور کونسی کتابیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ عالی میں التماس ہے کہ ہماری اس حقیر سعی کو مشکور فرمائے ربنا علیک توکلنا و الیک انبنا و الیک المصیر و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نیازمندان

محمد شریف۔ عبدالغنی تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ

نمبر ۲۰۵

تفسیر سورۃ التین

از مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی

انسان جب غور و فکر کی آنکھیں کھولتا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ نیچے زمین ہے اور سر پر آسمان ہے۔ ان کی وسعت اس کے خیال سے بالاتر اور ان کی قدامت اس کے ادراک سے باہر ہے ایک طرف وہ عظیم الشان پہاڑوں میں گھرا ہے جن کی چوٹیاں نامعلوم بلندیوں تک مرتفع ہیں دوسری طرف بلاخیز سمندر کی لہریں اس کے ارد گرد طوفاں خیز ہیں جن کے سامنے انسان کی ہستی تو کیا اس کی زمین بھی کائی کی طرح چھٹ جاتی ہے۔ ان عظیم ترین ہستیوں سے قطع نظر کر کے جب وہ چھوٹے چھوٹے جسموں کی قوت پر توجہ کرتا ہے تو اور زیادہ متعجب ہوتا ہے کہ ہستی و حیات کے یہ حقیر ذرات طاقت و عمل کی کیسی حیرت انگیز مثالیں اپنے اندر رکھتے ہیں؟!!

وہ ڈسنے والے سانپوں کی برق رفتاری پر خیال کرتا ہے، خونخوار جانوروں کی طاقت کو دیکھتا ہے، ابر کے ایک معمولی ٹکڑے سے بڑے بڑے شہروں کا

زیروزبر ہونا اس کے سامنے آتا ہے، پھونک سے اُڑ جانے والی چنگاری کی قوت اس کے پیش نظر ہوتی ہے اور جب ان تمام مناظر قدرت کو اپنے سامنے لاتا ہے تو بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ اے ہستئ انسانی! تو کیا ہے؟ تیری حقیقت کچھ بھی نہیں! بحرِ وجود میں پانی کا ایک بلبلہ، عالم خلق میں ہوا کا ایک جھونکا میدان تکوین میں مجموعۂ غبار کا ایک نقش پا!

لیکن سورۂ مبارکہ "والتین" میں قرآن حکیم نے اس خیال کی تردید کی ہے، اور شرف انسانی کے دلائل بینہ پیش کئے ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ عالم وجود کی دوسری چیزوں کے ساتھ انسان کو کیا نسبت ہے؟ بلاشبہ انسان پانی کا بلبلہ ہے مگر کونسا پانی؟ وہ جو آب بقا کا ایک سرچشمہ ہے! کچھ شک نہیں کہ انسان ہوا کا ایک جھونکا ہے، مگر کس ہوا کا؟ وہ، جو باغ وحدت کی ایک لہر ہے! ہاں یقیناً انسان کا وجود ایک نقش پا ہے، مگر کیسا نقش پا؟ وہ، جو وجود بحت کا سب سے زیادہ مکمل نشان ہے! خلاصہ یہ کہ سریر ظہور کا تاجدار اور منصبہ شہود کی رونق، وجودِ انسانی ہی ہے!

انسان کا اشرف خلائق ہونا ایک ایسا بین دعویٰ ہے جس کے لئے احتیاج دلیل نہ تھی۔ لیکن اپنی ہستی سے خود فراموشی ہی کبھی کبھی مانع کار ہو جاتی ہے اور اکثر دنیا کے بڑے بڑے اعمال صرف اسی لئے ناتمام رہ جاتے ہیں کہ ان کے کرنے والے اپنے آپ کو نہایت ضعیف و ناتواں سمجھ کر ہمت ہار دیتے ہیں۔ لہذا ایک ایسے ناموس الٰہی کے لئے جو "تبیانا لکل شیئ" اور "نور مبین" کی حیثیت رکھتا ہو، ضرور تھا کہ انسانی فضیلت کی کامل حقیقت کو اس کے سامنے

صاف صاف پیش کر دے۔

علاوہ ازیں یہ دین حنیف کے اس اہم ترین رکن کی ایک تمہید اور مقدمہ بھی تھا جسے میں حضرت شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی اصطلاح میں "قانون مجازاۃ" کے لقب سے تعبیر کرونگا۔

پس اس سورہ کے مضمون کی تقسیم دو قسموں میں ہو سکتی ہے:
(۱) شرف انسانی کا ثبوت۔ (۲) قانون مجازات۔

مبحث اوّل

والتین والزیتون وطور سینین و هذا البلد الامین لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ انجیر، زیتون، طور سینا، مکہ معظمہ، اس دعوی پر شاہد ہیں کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر حالت میں پیدا کیا ہے۔

"تقویم" کی تفسیر میں قاضی بیضاوی تحریر فرماتے ہیں:

تعدیل بان خص بانتصاب القامۃ و حسن الصورۃ و استجماع خواص الکائنات ونظائر سائر الممکنات (انتہی) تقویم کے معنی تعدیل کے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان سرو قامتی، حسن صورت، اور کائنات کے تمام خواص، اور تمام ممکنات کی تمثیلات کا مجموعہ ہے۔

اسی مضمون کو امام رازی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

"التقویم" تصییر الشیٔ علی ما ینبغی ان یکون فی التالیف والتعدیل یقال قومتہ تقویم کے معنی ہیں کسی شی کا ایسی حالت میں پیدا کرنا جس کے لائق وہ اپنی تالیف و تعدیل

تقویماً فاستقام و تقوم (انتہٰی) میں تھی۔ ایسے موقع پر جب کوئی شے چند
چیزوں سے ترتیب دیکر بنائی گئی ہو۔ اور وہ درست ہو، تو اہل عرب کہا کرتے
ہیں: قومتہ تقویما فاستقام و تقوم۔

محدث ابن جریر طبری اپنی شہرۂ آفاق تفسیر میں "تقویم" کے مختلف معنی نقل
کرتے ہوئے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں:

واولی الاقوال فی ذٰلک بالصواب ان یقال تقویم کے معنی میں بہترین قول یہ ہے کہ اس کے
المعنی ذٰلک فی احسن صورۃ واعدلہا (انتہٰی) معنی احسن و اعدل حالت کے ہیں۔

یہ تینوں مفسر اور ان کے سوا اور مفسرین بھی اگرچہ ترتیب الفاظ تعبیر مقصد میں
مختلف ہیں، تاہم منشاء و مآل سب کا ایک ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بیضاوی نے
نہایت مفصل اور جامع الفاظ میں "تقویم" کا مفہوم ادا کیا ہے جس کا خلاصہ
یہ ہے کہ کیا بلحاظ حسن صورت، اور کیا بلحاظ بلندیٔ قامت، انسان تمام ممکنات
کی تمثیل اور کل کائنات کے خواص کا مجموعہ ہے" اور یہ انسانی شرف کی بہت
بڑی دلیل ہے کہ جو اوصاف (مثلاً حیوانات میں حرکت اور ارادہ و انتقام نباتات
میں نشوونما۔ ملائکہ میں طاعت رب کریم وغیرہ وغیرہ) فرداً فرداً دیگر مخلوقات میں
موجود ہیں، وہ سب کے سب ایک وجود انسانی میں مکنون ہیں۔ فلینظر الناظرون
وبمحص المشتاقون۔

اسی مضمون کو قرآن حکیم نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے۔ صرف
اجمال و تفصیل کا فرق ہے ورنہ مقصود ایک ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وصورکم فاحسن صورکم: اے انسانو! خدا نے تم کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

یہاں صورت سے مراد صرف نقش و نگار جسمانی یا خد و خال نہیں، بلکہ صور معقولہ و قوائے ادراکیہ بھی ہیں۔ (کما صرح بہ الاصفہانی فی الذریعۃ والمفسرون فی تفسیرھم)۔

دوسری جگہ جو بہت زیادہ مفصل ہے اس طور پر مذکور ہے:

ولقد کرمنا بنی ادم وحملناھم فی — ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا فرمائی اور
البر والبحر ورزقناھم من الطیبات — تری و خشکی میں انکے چلنے کے لئے سواریاں بنائیں۔
وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا — عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں۔ یہانتک کہ مخلوقات
کے اکثر حصہ پر ان کو فضیلت و سیادت حاصل ہے۔

ان تمام آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقصود فضیلت انسانی کا ثبوت ہے۔ سورت التین میں اس دعویٰ کو مدلل و مشرح کیا گیا ہے، اور ثبوت میں چار دلیلیں بصورت قسم پیش کی گئی ہیں۔

محققین نے محاورات عرب و اشعار جاہلیت سے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ قسم اپنے مابعد بیان کے لئے شہادت و دلیل ہوتی ہے۔ امام رازی سورۂ ذاریات کی تفسیر لکھتے ہوئے شروع ہی میں تحریر فرماتے ہیں:

ان الایمان التی حلف اللہ تعالیٰ بھا — "تمام وہ قسمیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف
کلھا دلائل اخرجھا فی صورۃ الایمان — میں بیان فرمائی ہیں، سب کی سب قسم کی
مثالہ قول القائل لمنعمہ وحق نعمک الکثیرۃ — صورتوں میں دلائل ہیں۔ جس طرح کوئی اپنے

انی لا ازال اشکرک۔ فیذکر النعم محسن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہتا ہے:
وھی سبب مفید لدوام الشکر۔ وحق نعمتک الکثیرۃ انی لا ازال
اشکرک۔ اور اس قول میں نعمتوں کا ذکر دوام شکر کے لئے
سبب قرار دیتا ہے"

اس مسئلہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" پر یہ چار قسمیں "تین، زیتون، طور سینین، بلد امین" کیونکر دلیل ہو سکتی ہیں؟

تین و زیتون کی شہادت

"تین" کے معنے بعض مفسرین نے دمشق کے ایک پہاڑ اور بعض نے بیت المقدس کے ایک پہاڑی مقام کے بیان کئے ہیں لیکن یہ سب اقوال مرجوح ہیں۔ اور ان کے ضعف کی طرف بیضاوی وغیرہ مفسرین نے اشارہ بھی کیا ہے۔۔۔ مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس کے معنے اسی پھل کے لئے جائیں جس کو ہم اپنی زبان میں "انجیر" کہتے ہیں۔ اسی طرح زیتون سے بھی مراد وہی مشہور پھل ہے جس سے روغن نکالا جاتا ہے، اور جو اہل عرب کی ہر دلعزیز و جان پرور غذا ہے۔

ابن جریر لکھتے ہیں:

حدثنا ابن بشار۔۔۔ عن الحسن فی حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ قرآن شریف میں

قول اللہ والتین والزیتون قال تینکم تین سے مراد وہی پھل ہے جسے لوگ کھاتے ھٰذِ الذی یو کل وزیتونکم ھذا الذی یعصو ہیں اور زیتون سے مراد وہی ہے جس سے روغن نکالتے ہیں۔

امام رازی اپنی تفسیر میں تین و زیتون کے معنی بیان کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں "ھو تینکم و زیتونکم ھذا" اے اہلِ عرب! تین و زیتون سے مراد یہی تمہارے مشہور پھل ہیں۔

ان دونوں الفاظ کے معنی متعین ہونے کے بعد غور کرو کہ یہ شرف انسانی پر کس طرح شاہد ہیں؟ تم جانتے ہو کہ انجیر ایک نہایت چھوٹا سا پھل ہے، لیکن غذا و دوا میں بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ ذائقہ کے لحاظ سے نہایت شیریں ہے۔ باعتبار طبی فوائد کے قاطع بلغم، ملین طبع، مطہر کلیتین، مسمن بدن وغیرہ اس کے معمولی خواص ہیں۔

پس انجیر شاہد ہے کہ جسطرح یہ جسم صغیر ہو کر بے شمار فوائد کا مجموعہ ہے، اسی طرح وجود انسانی بھی جسماً مختصر لیکن مختلف قوتوں کا پتلہ، گوناگوں جذبات کا سراپا، بوقلموں اسرار کا مجسمہ ہے!

بے شک اس کی مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچ عالم تکوین کی غیر محدود کوہ پیکر ہستیوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا مگر ان ہڈیوں ہی میں وہ طاقت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں اور سمندروں کے طوفانوں کو مسخر کر سکتی ہے!

دوسری شہادت زیتون کی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح زیتون میں روغن حلول کئے ہوئے ہے، اور زیتون کی قدر اس کے روغن ہی کی وجہ سے ہے اسی

طرح انسانی جسم میں بھی روح کا حلول ہے، اور اس کا شرف بھی اس کی روح ہی سے ہے۔ ورنہ انسان مٹی کا ایک ڈھیر یا حشرات الارض کی گھناؤنی غذا ہے اور بس۔

یہاں پر دو سوال اور قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ جناب باری نے زیتون ہی کو شہادت کے لئے کیوں منتخب کیا، جبکہ یہ فائدہ اور روغن دار پھلوں یا اسی قسم کے تخموں سے بھی حاصل ہو سکتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن کریم کے اولین مخاطب ہیں، ان کے سامنے جو چیز بکثرت موجود تھی، وہ زیتون ہے، اور جو فوائد غذا و دوا کے اعتبار سے انہیں حاصل ہو رہے تھے، وہ بالکل ان پر واضح و آشکارا تھے۔

دوسرا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جبکہ روح جسم سے اعلیٰ و اشرف اور اس پر حاکم ہے، تو اس کی شہادت کو جسم کی شہادت سے مقدم ہونا چاہئے، اور اس لئے والتین کی جگہ والزیتون کے لفظ سے سورت کو شروع کرنا چاہئے تھا۔ یہ درست ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ دلیل و اثبات کے موقعہ پر مقدم ہونے کا وہ چیزیں حق رکھتی ہیں جو تجارب و محسوسات کے دائرہ میں ہوں۔ قطع نظر فلسفۂ جدیدہ کے جس کی بنیاد کا سنگِ اوّلین ہی تجربہ ہے، اگر ارسطو و افلاطون کے فلسفہ کو دیکھو اور کم از کم علامہ بہاری کی سلم کے آخر میں برہان کی بحث سامنے رکھو، تو معلوم ہو جائیگا کہ دلیل مفید یقین وہی ہو سکتی ہے جس کے مقدمات کی ترتیب امور یقینیہ اور تجربہ پر ہو، یا کم از کم ایسے مقدمات کی طرف ان کی تحصیل ہوتی ہو۔ بہر حال جسم اور اس کے فوائد محسوس اور بالکل ظاہر ہیں، اور روح

غیر محسوس ہے۔ پس اس لئے جسم کی شہادت کو حق تھا کہ وہ روح کی شہادت پر مقدم ہو، اور سورت کو والتین ہی کے لفظ سے شروع کیا جائے۔

نکتہ

زیتون کے لفظ میں ایک اور لطیف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ جب زیتون سے روغن نکال لیا جاتا ہے تو اس سے دوسرے فوائد کے علاوہ چراغ بھی روشن ہو سکتا ہے، اور وہ اپنے اردگرد تمام چیزوں کو منور کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ روح جو قفس عنصری میں مقید ہے، اگر بقدر طاقت بشری اس کو بھی علائق مادیہ سے پاک و صاف کر لیا جائے، تو پھر اس سے بھی بہت سی تاریک روحیں منور، اور ظلمانی قلوب روشن ہو سکتے ہیں!

طور سینین کی شہادت

"طور سینین" کی تفسیر میں تمام مفسرین اپنی عادت قدیم کے موافق بہت سے احتمالات بیان کرتے ہیں، مگر در اصل یہ سب تکلف ہے۔ اس سے مراد وہی پہاڑ ہے جو حضرت موسےٰ کے لئے جلوہ گاہ ربانی اور بنی اسرائیل کے لئے قانون شریعت کا مہبط تھا۔ ابن جریر نے بھی اس کو پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

والاولی الاقوال فی ذالک بالصواب   صواب تر قول اس بارہ میں اس شخص کا ہے

قول من قال طور سینین جبل معروف جو کہتا ہے کہ طور سینین سے مراد مشہور و معروف پہاڑ ہے۔

یہ شہادت ایک عجیب و غریب شہادت ہے جو ثابت کرتی ہے کہ ضعیف و ناتوان انسانی پتلہ میں مادی ترقی کی قوت کہاں تک ہے؟ اور وہ اپنے کمال کے بازوؤں سے اڑ کر کہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سے پہلے تم بنی اسرائیل کی حالت پر نظر کرو، وہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اسرائیلی برکت اور حضرت ابراہیم کے خدا کے وعدے کو فراعنہ کے قدموں میں پامال کر دیا تھا۔ اس بدبخت قوم نے فطرت کی سب سے زیادہ گراں قدر نعمت (یعنی حریت) کو ہمیشہ غیروں کی چوکھٹوں پر قربان کیا!

یہی بدنصیب بنو اسرائیل تھے جو انسانی عبدیت کے خون سے پیدا ہوئے۔ غلامی کے دودھ سے پلے۔ استبداد کی آب و ہوا میں بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ شرف قومی کا پاک جذبہ جس کی حفاظت دل کے خون اور دماغ کی روح سے ہونی چاہئے تھی، فراموش کر دیا گیا۔ آہ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے دیکھا کہ ظالم مصریوں کی خون آشام تلواریں اپنی پیاس ان کے معصوم بچوں کے خون سے بجھاتی ہیں؟ اور ان کی مخدرات کی عصمت کی فرعونیوں کے وحشت کدہ پر قربانی ہو رہی ہے۔ یذبحون ابناءھم ویستحیون نساءھم مگر تاہم اس بے حسی کی صدا سے باز نہ آئے کہ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون

بدقسمت عبرانیوں کی یہ حالت تھی، مگر جب جبل طور پر (جس کی قسم اس سورۃ میں کھائی گئی ہے) موسیٰ علیہ السلام کو قانون ملت عطا ہوا، اور اس پر آئندہ نسل نے عمل کیا، تو پھر وہ حالت ہوئی کہ جو غلام تھے وہ شہنشاہ

ہوگئے۔ جس قوم کو مصر میں سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے بھی پیٹ بھرنے کے لئے چین
سے نصیب نہ تھے، اس کے قدموں پر شام کے خزانے جمع کئے۔ کنعانیوں اور
حبشیوں کے دلفریب سبزہ زاروں کی یہ قوم مالک ہوئی۔ اموریوں (۱)
اور فرزیوں، حویوں اور یبوسیوں کی دودھ وشہد بنانے والی زمین ان کے
قبضہ میں آگئی۔ اسی کے آفتاب جلالت وسطوت سے بابل ونینوا کے قصر
جگمگا اُٹھے، اور اسی کے رعب وشوکت نے مصر کے ایوانوں کو ہلادیا۔ یہ سب
کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ پہلے وہ صراط مستقیم و راہ حق سے بے خبر تھی؛
اور اب اس پر عامل ہوگئی۔ پہلے وہ اس قانون الٰہی سے جو طور پر نازل ہوا
جو ترقی کے بے شمار اسرار سے معمور تھا، محروم تھی اور اب اس کی پرستار ہوگئی۔
پس خداوند تعالے نے اسی لئے طور کو جس سے ایک بہت بڑی قوم کے عروج و
زوال کی تاریخ وابستہ تھی، بطور شاہد کے پیش کیا ہے کہ دیکھو؛ یہ طور شاہد
ہے کہ انسان کو ہم نے اشرف ترین پیدا کیا۔ کیا باوجود ایک حقیر وضعیف ہستی
ہونے کے اس کی پرواز سب سے زیادہ بلند نہیں ہے؟

جس طرح کہ پہلے جسم کی شہادت اور اس کے بعد روح کی شہادت بیان
کی گئی تھی، اسی طرح تیسری شہادت میں پہلے جسمانی و مادی ترقی کا ثبوت
دیکر چوتھی شہادت اس کی روحانی ترقی کی دلیل قرار پائی۔

---

(۱) ان تمام الفاظ سے شام کے قبائل مراد ہیں، اور یہ تلمیح ہے کتاب خروج ۳/۱۷و۱۲
کے اس مضمون کی طرف جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انعامات کا وعدہ کیا گیا تھا۔

بلد امین کی شہادت

وھذا البلد الامین - امین امن سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کرنے کے ہیں۔ امانت کو امانت اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں حفاظت کی جاتی ہے۔ امین اگر اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اپنے حقیقی معنیٰ امن میں یہاں مستعمل ہے، تو اس کے معنیٰ ہونگے "حفاظت کرنیوالا" یا مثل قتیل بمعنی مقتول اسم مفعول کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے تو اس وقت اس کے معنے ہونگے محفوظ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں بلد امین سے مراد مکہ معظمہ (زاداللہ شرفہا) ہے۔ کذا صرح الکشاف والرازی والبیضاوی وغیرھم۔

پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ فارعن الدم (جو شخص کسی کو قتل کر کے بیت اللہ میں آچھپے) کے قصاص سے اور جانوروں کے شکار سے جبکہ وہ حرم میں داخل ہو جائیں، حفاظت کرنے والا ہے۔ کیونکہ نص قرآنی میں دوسری جگہ "حرما امنا" موجود ہے۔

دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ یہ کعبہ محترمہ قتل و غارت، جنگ و جدال وغیرہ سے محفوظ ہے۔ یہ چوتھی قسم ہے اور انسانی شرف کے جس شعبہ پر شہادت لائی گئی ہے، اس کو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک مختصر مقدمہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

محبت کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب اور اس کے جمیع متعلقات سے

الفت ہو۔ اس کے دیار و لباس کی یاد بھی وہی دل پر اثر کرے جو اس کی چشم بیمار کے اشارے کرتے ہیں۔ امرالقیس نے جب ایک سفر میں اپنی محبوبہ کی قیام کے آثار کو دیکھا، تو بیخود ہو گیا، اور یاران سفر سے کہنے لگا:

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل
بسقط اللوی بین الدخول فحومل

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ محبوب کے سوا کسی سے محبت نہ ہو۔ اس کا روئے آتشین قلب میں وہ آگ روشن کر دے کہ ماسوا کی اُلفت خاکستر ہو جائے، اور یہ عالم ہو:

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے !

یہ مرتبہ پہلے سے اعلےٰ ہے اور اسی کا نام مرتبۂ خلت ہے، جس کا نمونہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے لئے تو یہ مقام ظاہر ہے کہ جب آپ انکے جگر گوشہ و چشم و چراغ اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے ارشاد ہوا تو وہ بلا تامل تیار ہو گئے، اور اس پر حضرت باری سے یہ خطاب عطا ہوا:
واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔ اللہ تعالےٰ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا۔

لیکن حضرت اسماعیلؑ بھی اس مقام خلت سے محروم نہ تھے۔ چنانچہ جب راہ حق میں اُن کو قربان کرنے کے لئے کہا گیا (انی اذبحک فانظر ماذا تری) تو انہوں نے بلا تامل عرض کیا کہ اے باپ اگر آپ قربان کرنے کے لئے طیار ہیں، تو میں بھی قربان ہونے کے لئے حاضر ہوں۔ یاابت افعل ما تؤمر ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین (۳۷:۱۰۲)

کعبہ مکرمہ جو انہی پرستاران حق و فداکاران ملت کی بنا کردہ تعمیر ہے گویا تعلیم خلت کی درسگاہ ہے، جس کو یہ بزرگوار تعمیر کرتے جاتے تھے اور اپنے جذبۂ عشق میں معمور ہو کر کہتے جاتے تھے:

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔ ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك وارنا مناسكنا وتب علينا انك انت التواب الرحيم۔ ربنا وابعث فيهم رسولا منهم يتلوا عليهم اٰيٰتك ويعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم انك انت العزيز الحكيم (بقرہ: ۱۵۴)

اے ہمارے خدا تو ہمارے اس کام بناء کعبہ کو قبول فرما اس لئے کہ تو ہی ہماری دعا کو سننے والا اور ہمارے کاموں کو جاننے والا ہے۔ اے پروردگار اب تو ہم کو اپنا فرمانبردار بندہ بنا لے اور ہماری نسل سے ایک مطیع و منقاد امت قائم کر۔ اے خدا اپنے ارکان عبادت ہم کو ہدایت کر اور ہم پر رحمت نازل فرما کیونکہ تو ہی تواب و رحیم ہے۔ اور پھر اس امت میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو ان میں سے ہو۔ وہ رسول تیرے احکام ان کو سنا دے اور تیری کتاب و حکمت کی باتیں ان کو سکھائے۔ تو سب کچھ کرسکتا ہے، اسلیے کہ تو سب پر غالب اور سرچشمۂ حکمت ہے۔

پس درسگاہ خلت یعنی بیت ابراہیمی اس پر شاہد ہے کہ انسانی روح کہاں تک ترقی کرسکتی ہے، اور اس کی انتہا کیا ہے؟ تم کو معلوم ہو گیا کہ اس کی ترقی اس حد تک ہے جہاں پہنچ کر ایک ہی مقصود، ایک ہی مطلوب اور ایک ہی شاہد و مشہود سامنے ہوتا ہے، جس کی چشم و ابرو کے اشاروں اور وہن حق طلب کی مسکراہٹ پر اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی قربان کر دیا جاتا ہے۔

اے گم گشتگان طریق حق! اگر دین حنیف تمہارے ہاتھوں میں اسمٰعیلی

خون تمہاری رگوں میں، اور ابراہیمی دعا کی امت مسلمہ تم ہو، تو پھر تمہارے لئے ذریعہ فلاح ونجات وہی جذبہ خلت، وہی جوش محبت، وہی سودائے عشق وہی طریق ابراہیمی ہے جس کی شہادت تمہارا کعبہ مکرمہ بزبانِ حال پیش کر رہا ہے۔ اور اس کی صدا اس کے درودیوار سے آرہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس امر کو مفصل بیان کیا ہے کہ روح وجسم کا وجود اور ان کا اجتماع دوسرے جانداروں میں بھی ہے۔ لیکن حصول سلطنت اور مقام خلت جن پر تیسری وچوتھی قسم شاہد ہے، یہ انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان دو آخری خصوصیتوں میں سے پہلی قوت حیوانیہ انسانیہ، اور دوسری قوت ملکوتیہ کا خاصہ ہے۔ پس ان خصائص وقویٰ، ان فوائد ومنافع کے انکشاف کے بعد کون ہے جو اس میں شک کرسکتا ہے کہ: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم؟

اس تفسیر کے شایع ہونے پر جناب مولوی وصی احمد صاحب بلگرامی نے حضرت امام ابوالکلام کی خدمت میں چند ضروری استفسارات پیش کئے جن کے جواب میں حضرت امام نے سورہ "والتین" کی شہرہ آفاق تفسیر لکھی استفسارات مراسلت کی صورت میں ذیل میں درج ہیں:-

"جناب علامہ دوران وحید الزمان مولانا ابوالکلام صاحب آزاد۔ دام مجدکم

پس از سلام مسنون گذارش یہ ہے کہ جناب مولوی مظہرالدین صاحب شیرکوٹی نے جو سورہ "والتین" پر روشنی ڈالی ہے اس کے متعلق چند ضروری استفسارات ہیں:

ملاحظہ ہو فرماتے ہیں: "انجیر، زیتون، طورسینا، مکہ معظمہ، اس دعویٰ پر شاہد ہیں کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر حالت میں پیدا کیا ہے"

طورسینا اور مکہ معظمہ کی شہادت تو واضح ہے کہ حضرت موسیٰ اور جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں نورِ وحدت سے انہیں مقاموں پر منور ہوئیں ضعیف انسان کی بزرگی پر یہ دونوں صاد کرتے ہیں، اور اس لئے گواہ لائے جا سکتے ہیں۔ مگر تین اور زیتون کی شہادت کے متعلق جناب موصوف یوں فرماتے ہیں:

(۱) "انجیر ایک نہایت چھوٹا پھل ہے، لیکن غذا و دوا میں بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ ذائقہ کے لحاظ سے نہایت شیریں ہے۔ بلاعتبار طبی فوائد کے قاطع بلغم، ملین طبع، مطہر کلیتین، مسمن بدن، وغیرہ اس کے معمولی خواص ہیں۔ پس انجیر شاہد ہے کہ جس طرح جسم صغیر ہو کر بے شمار فوائد کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح وجود انسانی بھی جسماً مختصر، لیکن مختلف قوتوں کا پتلہ ہے"۔

(۲) "جس طرح زیتون میں روغن حلول کئے ہوئے ہے اور زیتون کی قدر اس کے روغن ہی کی وجہ سے ہے، اسی طرح انسانی جسم میں بھی روح کا حلول ہے، اور اس کا شرف بھی اس کی روح ہی سے ہے، ورنہ انسان مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ اور بس"

ہم نے یہ سب مانا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح انجیر اپنے جسم صغیر میں بے شمار فوائد اور زیتون اپنے قالب میں تیل کا خزانہ رکھتا ہے اسی طرح روئے زمین پر کھور نیز ملک عرب میں ہزاروں لاکھوں ایسے پھل ہیں، جو بھی

خواص رکھتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ اتنی بڑی شہادت پیش کرتے وقت جناب باری نے انجیر اور زیتون ہی کو چنا؟

جناب موصوف کی توضیح سے تسکین نہیں ہوتی۔ انگریزی پڑھنے والے طلباء کی آنکھیں اور دل ظاہر ہے کہ آج کل کلام مجید کی معرفت و نکات سے نابینا ہیں۔ اندھا آدمی مجبوراً ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے، اس صورت میں بینا آنکھوں کا فرض ہے کہ صحیح راستہ بتلادیں۔ لہٰذا یہ عریضہ ارسال خدمت گرامی ہے کہ تین اور زیتون کی شہادت پر شکوک مذکورۂ بالا کا لحاظ کرتے ہوئے جناب مزید روشنی ڈالنے کی تکلیف گوارا فرمائیں، باعث مشکوری ہوگا۔ والسلام

آغاز سورۂ "والتین" از حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

قرآن حکیم کے فہم و درس کا جو ذوق آپ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے اس سے یہ فقیر نہایت خوش وقت ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ذوق میں برکت و ثبات عطا فرمائے، اور آپ کے امثال و نظائر سے ہمارے جدید مدارس کی عمارتیں معمور ہو جائیں۔

آپ کا سوال دراصل مسئلہ "اقسام القرآن" سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی قرآن حکیم کی جن سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حروف قسم کے ساتھ بعض اشیاء کا ذکر فرمایا ہے، ان کی حقیقت، اور جواب قسم سے ان کا ربط و تعلق۔ از انجملہ سورہ والتین ہے اور اس میں سب سے پہلے تین و زیتون کی قسم نظر آتی

ہے۔ درس وفہم حقائق قرآنیہ کی مختلف راہیں ہیں اور بسا اوقات ان کی حقیقت مختلف نظروں کو مختلف روشنیوں میں نظر آتی ہے۔ تین وزیتون کے متعلق ایک تفسیر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی جس کو مولانا مظہر الدین صاحب نے اپنے مضمون میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے اور ان کے خصائص کو نوع انسانی کے جسم وحقیقت کے خصائص سے تشبیہ دی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سورت کے موضوع اور بقیہ اقسام کے ربط کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ مزید غور وفکر اور جستجوئے حقیقت کے لئے قدم اٹھانا چاہئے۔ میں آپ کے سوال کا جواب دو صحبتوں میں دونگا۔

چند مقدمات مہمہ

سب سے پہلے چند مقدمات آپ کے سامنے آجائیں جن پر ہمارے تمام مباحث تفسیر مبنی ہیں۔

(۱) قرآن حکیم کی ہر سورت کا ایک موضوع (سبجکٹ) ہے۔ اور اوّل سے لیکر آخر تک وہ سورت اسی پر مبنی ہے۔ جس قدر مطالب درمیان میں آگئے ہیں وہ سب کے سب اسی ایک موضوع اصلی کے ناگزیر ضروری اطراف بحث وتعلیم ہیں۔

(۲) ہر سورۃ کی ابتداء وانتہا اس موضوع کے معلوم کرنے کی کنجی ہے۔

(۳) جب ہر سورۃ کا ایک موضوع ہے تو یہ چیز بھی ضمناً آپ کو معلوم ہوگئی

کہ قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں، اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ سلسلۂ بیان بتدریج اجمال سے تفصیل، دعویٰ سے دلیل اور تعلیم سے امثال و نظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے "تصریف آیات" سے جا بجا تعبیر کیا ہے۔ "صرف" کے معنی لغت میں "رد الشیٔ من حالۃ الی حالۃ" کے ہیں (کما صرح بہ الاصفہانی)۔

(۴) "قسم" کے معنی شہادت و دلائل کے ہیں، قرآن حکیم نے جس چیز کو حروف قسم کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ ایک شاہد ہے جو اپنے مابعد دعویٰ کے لئے دلیل پیش کرتا ہے۔ قسم کا مقصد استشہاد ہوتا ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں یعنی خدا شاہد ہے کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا۔ سورہ والفجر میں ہے

"ھل فی ذالک قسم لذی حجر" یعنی ان چیزوں میں صاحب عقل کے لئے بڑی ہی شہادت ہے۔ منافقین کہتے تھے کہ:

"نشھد انک لرسول اللہ" ہم گواہی دیتے ہیں آپ اللہ کے رسول ہیں۔ خدا نے اُن کی تکذیب کی اور کہا:

"اتخذوا ایمانھم جنۃ" انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ منافقین نے شہادت دی تھی۔ قسم نہیں کھائی تھی۔ پس خدا نے خود ہی شہادت کو قسم سے تعبیر کر کے حقیقت کھول دی۔

لیکن چونکہ عام مفسرین متاخرین نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا، اس لئے وہ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس میں بڑائی اور عظمت ہو۔ اس لئے تمام قسموں میں صرف عظمتوں ہی کو تلاش کرتے رہے۔

ان کی شہادت حق و دلالت حقائق پر نظر نہ ڈالی۔ امام رازی گو فرماتے ہیں کہ قسم ایک طرح کی دلیل ہے، لیکن چونکہ اصل حقیقت سے پوری طرح متاثر نہیں ہیں، اس لئے اسی غلطی کو شروع کردیتے ہیں جو اعتراف معنی دلیل کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی تھی یعنی تین اور زیتون کی عظمت اور بزرگی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جب اور کچھ نظر نہیں آتا تو فرماتے ہیں کہ تین (انجیر) کا مزہ بہت اچھا ہے، اور وہ معدے کے لئے مسہل و ملین ہے، اور زیتون کی لکڑی کے اندر تیل ہے، گویا نہ تو دنیا کے اندر کوئی اور پھل ملین ہے اور نہ کوئی اور شے اپنے اندر روغن رکھتی ہے!

سچ یہ ہے کہ متاخرین میں یہ فضیلت و مزیت اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے ارشد تلامذہ علامہ ابن قیم کے لئے مخصوص کردی تھی کہ حقائق و معارف کتاب و سُنت کے جمال حقیقی کو بے نقاب کریں، اور جو پردے متاخرین نے یکے بعد دیگرے ڈال دئے ہیں، ان کو اللہ کی بخشی ہوئی قوت مجددہ و مصلحہ سے چاک چاک کردیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے ان دو عظیم الشان انسانوں نے اقسام القرآن کی اس حقیقت کو جا بجا واضح کیا ہے۔ اور موجودہ زمانے میں سب سے بڑا خوش نصیب انسان وہ ہے جس کے دلوں کو اللہ ان مصلحین حقیقی کی تصنیفات کے فہم و درس کے لئے کھول دے کہ ان کا نورِ علم مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست ماخوذ تھا۔

موضوع سورۂ والتین

دنیا میں انسان اپنے اندر دیکھتا ہے تو اس کو جذبات و مؤثرات کا ایک عجیب مخلوط اور متضاد ہجوم نظر آتا ہے۔ باہر دیکھتا ہے تو اس کی ناکامیاں اور مایوسیاں اس کی کامیابیوں اور امیدوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔

جذبات کے اعتبار سے وہ ایک ہی وجود ہے جو کبھی فرشتوں کی طرح محبت و ہمدردی اور شرافت و عفت کا پیکر ہے، اور کبھی قتل و ہلاکت اور خونریزی و سفاکی میں سانپوں کے زہر سے بدتر اور درندوں کے پنجوں سے اسفل ہے۔ وہی انسان جو جانوروں کو تکلیف میں دیکھ کر ہمدردی کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے بسا اوقات اپنے بھائیوں کا بیدریغ خون بہانے لگتا ہے تاکہ ان کے خون سے اپنی خودغرضی کی پیاس بجھائے۔

خارجی اعمال کے لحاظ سے اس کی بوقلمونی اور زیادہ عجیب ہے۔ وہ ایک ہی وجود ہے جو کبھی تاج و تخت حکومت پر جلوہ آرا ہوتا ہے، اور کبھی کتوں کی طرح غلامی کی خاک پر لوٹتا ہے۔ کبھی اس کی ہمت سر بفلک عمارتوں کے بنانے، پہاڑوں کے کاٹنے، سمندروں کے مسخر کرنے سے نہیں تھکتی، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتوں کی ایک دیوار کو کھڑا کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ کبھی بجلی سے ڈرتا ہے، طوفان سے لرزتا ہے، آسمان کو دہشت و خوف

سے دیکھتا ہے، اور پھر اس قدر ان کے مظاہر و شئون سے مرعوب ہوجاتا ہے
کہ ان کی پرستش و بندگی شروع کردیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ان کے آگے
صرف جھکنے اور عاجزی ہی کے لئے ہوں۔ ان کے تنزل و تسفل کے لئے یہ مثال
بھی کافی نہیں۔ ایک وقت آتا ہے جبکہ دنیا میں پتھر کے ان ٹکڑوں کے
لئے جو راستوں میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، عزت ہوتی ہے، پر انسان کے
لئے کوئی عزت باقی نہیں رہتی وہ انسان ہوکر پتھروں کے آگے ماتھا ٹیکتا،
ان کو اپنے آقا اور خداوند کی طرح پوجتا، اور اپنی حیات و ممات کو ان کی
رضا و غضب میں منحصر یقین کرتا ہے۔ کتا زیادہ سے زیادہ انسان کے
آگے جھکتا ہے کہ وہ کتے سے اشرف و اعلٰے ہے۔ گھوڑا اور ہاتھی انسان
کے چاکر بن جاتے ہیں کہ انسان کی عظمت کا مقابلہ نہیں کرسکتے، مگر انسان
کتے سے بھی بدتر اور گھوڑے اور ہاتھی سے بھی اسفل ہے کہ اپنے سے اعلٰے
کے آگے نہیں بلکہ اپنے ہی جیسے کے سامنے یا اپنے سے بھی بدتر کے آگے
جھکتا اور اوندھا ہوتا ہے!

تم کسی کتے کو نہیں دیکھوگے کہ وہ کسی کتے کے آگے عاجزی کرے،
لیکن یہ انسان ہی ہے کہ اپنے جیسے ایک انسان دوسرے کو چاندی سونے کے
تخت پر بٹھاتا ہے، اور پھر کتوں کی طرح اس کے آگے زمین پر لوٹتا اور گرد ذلت
چاٹتا ہے۔

اعمال انسانی کے اس اختلاف و تضاد اور انفعالات و تاثرات عملیہ
کی اس بوقلمونی و رنگارنگی میں انسانی فطرت اصلیہ کی حقیقت گم ہوجاتی

ہے۔ کچھ نہیں کھلتا کہ یہ عجیب جانور جو سب سے بڑا بھی ہے اور سب سے چھوٹا بھی، اس کی اصلی متاع فطرت کیا تھی جو اسے دی گئی تھی؟ وہ فی نفسہٖ شیطان ہے یا فرشتہ؟ بھیڑیا ہے یا بکری؟ تاریکی ہے یا روشنی؟ نیک ہے یا بد؟ اچھا ہے یا برا؟

مسئلہ خیر و شر فطرت انسانی:

یہ سوال انسان کی اصلی فطرت وجبلت کی نیکی اور بدی کا ہے۔ یعنی کیا بالطبع وہ نیک بنایا گیا ہے یا بد؟ یا دونوں؟ اس کے داخلی جذبات و داعیات کی کشاکش اور خارجی اعمال و نتائج کا میدان تو نور و ظلمت، ملکوتیت و بہیمیت، حسن و بدروئی، علو و تسفل، عظمت و ذلت، نیکی و بدی، دونوں کا مجموعہ نظر آتا ہے، اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دراصل وہ کیا ہے؟

دنیا میں ابتدا سے لیکر اب تک اس سوال کے متعلق تین مختلف مذاہب نظر آتے ہیں:

(۱) انسان کی اصلی جبلت و فطرت بدی ہے لیکن باہر کی تربیت اس کو عارضی طور پر خوشنما کردیتی ہے۔ وہ خصائص فطرت کے اعتبار سے ایک خالص حیوان ہے۔ لیکن تربیت پذیری کے اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ درخت کی جڑ اور شاخیں متناسب نہیں ہوتیں، لیکن ان کو کاٹ کر اور چھیل کر ہم درست کر لیتے ہیں۔ فطرت کی تمام خلقت کا یہی حال ہے۔ اصل

فطرت میں قوام و اعتدال نہیں ہوتا۔ چھیل چھال کر اسے سڈول بنا لیا جا سکتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ باہر کی صناعی تربیت سے ایک نیا رنگ اپنے اوپر چڑھا لیتا ہے، لیکن جب اوپر کا رنگ کمزور ہو جاتا ہے تو اصلی تہ نظر آ جاتی ہے۔ بڑا سے بڑا مہذب انسان بھی غصہ و انتقام میں درندہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مصنوعی رنگ اتر گیا اور اس کی اصلی فطرت شر ابھر آئی۔

یہ مذہب "مذہب شر" یا مذہب یاس ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو شر اور یاس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یونان میں دیو جانس کلبی (ڈائیگونس) اسی فلسفۂ اخلاق کا مشہور پیشوا گذرا ہے۔

(۲) دوسرا مذہب ان لوگوں کا ہے جو انسان کی فطرت کو بالکل ایک سادہ حالت میں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں نہ تو نیکی ہے اور نہ بدی ہے۔ نہ وہ کانٹوں کی چبھن ہے اور نہ پھولوں کی مہک۔ وہ محض ایک منفعل، اثر پذیر اور نقش انگیز وجود ہے جو اپنے ساتھ کچھ نہیں لاتا مگر دنیا میں آکر جو کچھ پاتا ہے لے لیتا ہے۔ وہ ایک دامن ہے جس کے اندر سوائے گنجائش و عمق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس میں ہر طرح کا بوجھ بھر لینے کی صلاحیت ہے مگر ابھی کوئی چیز اس میں بھری نہیں گئی ہے۔ اب اگر اسی کو پتھر ملا ہے تو اس کو بھر لیگا، پھول ملے ہیں تو اُن کو اٹھا لیگا۔ یہ تشبیہ واضح تر یہ کہ انسان کی فطرت اصلاً ایک سفید کاغذ ہے۔ اس پر کوئی نقش نہیں ہوتا۔ نہ تو کانٹے کی تصویر ہوتی ہے اور نہ پھول کی۔ اب جو کچھ اس پر

بنایا جائے گا، بن جائے گا۔

حکمائے یونان میں اس مذہب کا ایک دور رہ چکا ہے۔ معتزلہ نے بھی زیادہ تر اسی کی پیروی کی تھی۔ آج یورپ میں بھی حکمائے اخلاق کا ایک بڑا گروہ یہی کہتا ہے

(۳) تیسرا مذہب "جامع خیر و شر" ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ:

آدمی زادہ طرفہ معجون ست!

نیکی اور بدی دونوں اس کی فطرت میں موجود ہیں۔ بالقوۃ وہ شیطان اور فرشتہ دونوں ہے، قوت ملکوتی و بہیمی دونوں رکھتا ہے۔ دنیا میں آکر جس قسم کے خارجی مؤثرات ملتے ہیں، انہی کے مطابق اس کی کوئی ایک قوت نشوونما پاتی اور بروز کرتی ہے۔ اگر وہ اثرات اس کے لئے جمع ہو جائیں جن کو تم "نیکی" کے لقب سے پکارتے ہو، تو اس کی قوت ملکوتی اُبھرے گی، اور چمکیگی، لیکن اگر برخلاف اس کے بدی کا گرد و غبار چھا جائیگا تو نیکی کی چمک ماند پڑ جائیگی، اور بدی کی تاریکی پھیل اُٹھیگی۔ اس مذہب کے پیروؤں کے نزدیک انسان کے اندر بالقوۃ ملکوتیت و بہیمیت مخزون ہیں، مگر ان کا فعل تربیت و تاثیرات سے نمود پکڑتا ہے۔ گویا نیکی اور بدی دو بیج ہیں جن کو انسان اپنے ساتھ دنیا میں لاتا ہے، پھر جس بیج کو تربیت تاثر کا پانی مل جاتا ہے، وہی پھولتا پھلتا اور تناور درخت بنتا ہے۔

دنیائے قدیم و جدید دونوں میں اس مذہب نے بہت ترقی و مقبولیت حاصل کی ہے۔ ارسطو کا بھی یہی مذہب تھا، اور تقریباً تمام حکمائے اسلام نے اسی کو قبول کیا ہے۔ ابن مسکویہ جس نے یونانی اخلاق کو سب سے

زیادہ مشرح و منظم لکھا ہے، اسی مذہب کا داعی ہے۔ دورِ جدید کے حکمائے اخلاق میں بھی یہی مذہب زیادہ مقبول ہے۔ امام فخرالدین رازیؒ وغیرہ تمام مفسرین تفسیر قرآن میں اسی مذہب کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور "وھدیناہ النجدین" اور "فالھمھا فجورھا وتقواھا" وغیرہ آیات کریمہ کی تفسیر اسی مذہب کی بنا پر کرتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ خیر و شر فطرت کے متعلق دنیا کا غالب اور عام اعتقاد یہی ہے۔ اور چونکہ انسانی اعمال و نتائج میں خیر و شر دونوں نظر آتے ہیں، اس لئے ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہی مذہب زیادہ صحیح و احق ہے۔

القرآن الحکیم

قرآن حکیم نے دین الٰہی کا دوسرا نام "العلم" رکھا ہے:

ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی   اور اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی جاءك من العلم ـ کی، بعد اسکے کہ تیرے پاس علم یعنی دین الٰہی آچکا ہے۔ الخ

ہر جگہ گمراہ قوموں کے بغی و ضلالت پر ملامت کرتے ہوئے کہا:

فما اختلفوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم (جاثیہ ۶۳)

حاملین قرآن کی نسبت کہا: فی صدور الذین اوتوا العلم ۔ وہ اُن کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا۔ نیز کہا کہ یہ "برہان" ہے "بصائر" ہے "نور" ہے "بصیرت" ہے، اور ہر جگہ کفر کو کہا کہ وہ "ظن" ہے "شک" ہے "تخمین" ہے اور اٹکل کی باتیں اور قیاسات ہیں: مالھم بذلك من علم

ان ھم الا یظنون - پھر دین الٰہی کے ماننے اور اطاعت کرنے کو "ایمان" کہا اور ایمان والوں کو "مومن"۔ ایمان امن سے ہے اور امن کے معنے "طمانیۃ النفس" اور زوال خوف و شک کے ہیں۔ ان تمام تصریحات سے واضح ہؤا کہ دنیا میں علم و یقین صرف ایک ہی ہے اور وہ وحی الٰہی ہے، اور اس کے سوا اور جس قدر ادعاء علم کے اعلانات ہیں ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نیز یہ کہ "ایمان" کے معنی "یقین" حاصل کرنے کے ہیں، اور مومن وہ ہے جس کے پاس "شک" کی جگہ "یقین" ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مومن اور غیر مومن کو "الذین یعلمون" اور "والذین لا یعلمون" اور "الاعمیٰ" اور "البصیر" سے تشبیہ دی یعنی صاحبان علم اور بینا، اور ارباب جہل اور اندھے!

اس بنا پر علم اضافی اور محدود تو دنیا کے پاس ہے مگر علی الاطلاق "العلم" قرآن کے سوا اور کوئی نہیں، اور قرآن جس کے پاس ہے وہی دنیا میں سب سے زیادہ اعلم اور سب سے بڑا جاننے والا ہے۔

پس شک و ظن کے تمام اختلافات کو اسی "العلم" اور "البصائر" کے آگے عرض کرنا چاہیے کہ وہی ایک حکم حقیقی ہے۔

اس عاجز نے جہاں تک غور کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ خیر و شر فطرت کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ ان تینوں مذہبوں سے الگ ہے۔ اور تمام دنیا میں وہ پہلی آواز ہے جو انسانیت کے شرف فطری و خیریت کو ان تمام ظنون و اوہام کی پیدا کردہ ذلتوں سے نجات بخشتی ہے۔ ان تینوں مذہبوں میں پہلا مذہب فطرت انسانی کو زمین کی گھانس اور مٹی کے تودوں سے

زیادہ حقیر قرار دیتا ہے۔ گھانس حیوانات کی غذا ہے اور مٹی سے دیوار بنائی جا سکتی ہے، مگر یہ مذہب کہتا ہے کہ انسانی فطرت میں مضرت کے سوا کوئی نفع نہیں۔ یہ مغرور انسان کا اپنی نسبت پہلا مایوس فیصلہ تھا۔

اس کے بعد دوسرا مذہب سامنے آتا ہے اور اس کو ایک سادہ صفحہ قرار دیتا ہے جسمیں نہ تو نیکی کا نقش ہے اور نہ بدی کا۔ بلاشبہ یہ مذہب انسان کیلئے پہلے مذہب جیسا بے رحم نہیں ہے تاہم یہ بھی اسکی فطرت کو کوئی شرف نہیں بخشتا اور ایک منفعل اسی طرح کے اثر کو قبول کرنے والا وجود قرار دیکر چھوڑ دیتا ہے۔

تیسرا مذہب سب سے زیادہ مقبول، سب سے زیادہ عام اور اس بارے میں انسانی علم کی سب سے بڑی جست ہے۔ لیکن وہ بھی پھولوں کے ساتھ کانٹوں کو برقرار رکھتا اور انسان کو فرشتگی دیگر شیطنت کا بھی مساوی حصہ بخشتا ہے اسکی غایت تحقیق یہ ہے کہ بالفطرت اسمیں نیکی بھی ہے اور بدی بھی۔ پس وہ جس طرح اچھا ہے برا بھی ہے۔ اگر بدی کا پلہ نہ جھکا تو نیکی کے پلے کو بھی زیادہ وزن نصیب نہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے اس کی فطرت

یہاں بھی شرافت و احترام سے محروم و نامراد ہے، وذالك مبلغهم من العلم۔

ان تینوں مذہبوں نے فطرت انسانیہ کی حقیقت کو کھو دیا اور وہ اپنا سراغ نہ پا سکے۔

یہ مذاہب حکماء اخلاق اور عام افکار و آراء انسانی کے ہیں۔ لیکن آج جس قدر مذاہب دنیا میں موجود ہیں، ان کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ اکثر حالتوں میں تو وہ پہلے مذہب کی دعوت دیتے ہیں۔ بعض حالتوں میں اگر ان کے شارحین تاویلات ودکیکہ سے کسی بلند درجہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو بھی آخری مذہب سے آگے ان کا قدم نہیں بڑھتا۔

لیکن قرآن یعنی "العلم" دنیا میں اس لئے نہیں آیا کہ فطرت کے محجوب جمال کو اور زیادہ مستور کر دے، بلکہ اس کی دعوت کی اولین حقیقت یہ تھی کہ انسانی ضلالت وظنون نے فطرت وحقیقت پر جو پردے ڈال دئے ہیں، ان کو اس طرح چاک چاک کر دے کہ انسان اپنے ہی آئینہ کے اندر اپنی صورت دیکھ لے۔ پس وہ اوّلین آواز ہے جس نے سب سے پہلے اس گم شدہ حقیقت کا سراغ بتلایا، اور دعوا کیا کہ انسان کی فطرت وجبلت نہ تو محض ایک صفحۂ سادہ ہے نہ صرف بدی اور شر کی ناپاکی ہے، اور نہ ہی ملکوتیت اور بہیمیت کا مرکب، بلکہ وہ ایک خالص وکامل نیکی ہے، جس میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور کوئی قوت اس کے اندر ایسی نہیں رکھی گئی ہے جس میں بدی اور برائی کا اصلاً بیج ہو۔ وہ صرف نیکی ہی لے کر دنیا میں آتا ہے، نیکی ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور نیکی ہی کیلئے اسکو سب کچھ دیا گیا ہے۔ لیکن وہ دنیا میں آکر اپنی فطری نیکی کی حفاظت نہیں کرتا، اس کے نشوونما کی راہیں بند ہو جاتی ہیں، اور اس کے طبیعی ابھار کو اس طرح دبا دیا جاتا ہے جس طرح کسی پودے پر ایک پتھر رکھ کر اس کی قوت پامال کردی جائے۔ پس انسان کے اندر جو کچھ ہے وہ خالص نیکی ہے، اور جس قدر بھی برائی ہے، وہ اس کا کسب خارجی ہے۔ نیکی اس کا فطری عمل ہے، اور بدی غیر فطری، خارجی، اور یکسر صناعی۔ اگر وہ نیک ہے تو یہ فطرت ہے، اگر بد ہے تو یہ تصنع ہے۔ اس کو بیج ایک ہی دیا گیا ہے جو صرف نیکی کا ہے۔ جب وہ اُبھرتا ہے تو تم کہتے ہو کہ یہ نیکی ہے، جب پامال کر دیا جاتا ہے تو تم کہتے ہو کہ بدی ہے۔ حالانکہ تم نہیں جانتے کہ پھل اور پتوں کا نہ لگنا کوئی الگ وجود نہیں ہے،

بلکہ درخت کے نشوونما کے عدم کا نام ہے۔

خدا نے اُس کو روشنی دی ہے' اور اس کے اندر آئینہ رکھدیا ہے۔ وہ دنیا میں آتا ہے اور باہر کے پردوں سے اندر کی روشنی کو ڈھانپ دیتا ہے۔ باہر کے گرد و غبار سے اندر کے آئینہ کو مکدر کر دیتا ہے۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ تاریک ہے مگر نہیں سوچتے کہ اس کی اصل روشنی تھی۔ تاریکی نہ تھی۔ اس نے روشنی کو چمکنے نہ دیا۔ تم کہتے ہو کہ اسکے دامن میں زنگ اور غبار تھا۔ حالانکہ زنگ و غبار نہ تھا بلکہ صاف و شفاف آئینہ تھا۔ باہر سے گرد اُڑ رہی تھی۔ اس کو چاہئے تھا کہ دامن سے ڈھانپ لیتا' مگر اس نے گرد و غبار کو پسند کیا اور آئینہ کی چمک کی قدر نہ کی۔ اب وہ غبار آلود ہے کچھ دنوں کے بعد بالکل تاریک ہو کر لوہے کا ایک سیاہ ٹکڑا بن جائیگا' مگر اسلئے نہیں کہ اس کے پاس لوہا تھا' بلکہ صرف اس لئے کہ آئینہ کو صاف نہ رہنے دیا۔

یہی انسان کی وہ فطرت اصلی ہے جس کو قرآن حکیم فطرت صالحہ قرار دیتا ہے' یعنی وہ فطرت جو بالکل اپنی اصلی نیکی کی حالت میں ہے' اور باہر کی کسی بدی سے اس کو آلودہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہی فطرت صالحہ دین الٰہی ہے' یہی دین قیم ہے' یہی دین حنیفی ہے' یہی صراط مستقیم ہے' یہی فطرت اللہ ہے' یہی صبغۃ اللہ ہے' اور قرآن کی اصطلاح میں سب سے آخر مگر سب سے زیادہ جامع و حاوی نام اسی کا "اسلام" ہے۔

اور اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ انسان کی اصلی فطرت "اسلام" ہے اور "کفر" ایک صناعی اور غیر فطری عمل ہے۔ اگر ایک انسان "مسلم" ہے تو اس کو یوں کہو کہ وہ اپنی اصلی فطرت صالحہ پر قائم ہے' اس کی فطری روشنی نور

دے رہی ہے، اس کی فطرت خیر کی قندیل کو باہر کا کوئی طوفان بجھا نہ سکا، اور وہ ویسا ہی ہے جیسا فطرت نے اسے بنایا تھا۔ لیکن اگر ایک انسان "مسلم" نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فطرت حقیقی کا چراغ بجھ گیا، اس کے اندر کا آئینہ زنگ آلود ہو گیا، گرد و غبار کی تو بر تو تہوں نے اس کو سیاہ کر دیا، اور وہ فطرت کی صورت حقیقی کی جگہ ایک مسخ شدہ غیر فطری و مصنوعی جانور بن گیا۔ معصیت سے یہ فطری آئینہ زنگ آلود ہوتا ہے اور کفر زنگ آلودگی کی وہ آخری حالت ہے جبکہ آئینہ بالکل سیاہ ہو گیا، اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہ رہی؛ ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ۔ اور؛ سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون۔ وغیرہ تصریحات قرآنیہ میں اسی آخری مرتبۂ ضلالت کی طرف اشارہ ہے۔ اور لھم قلوب لا یفقھون بھا اور؛ جعلنا علیٰ قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ۔ اور؛ کالانعام بل ھم اضل میں اسی فطرت صالحہ کی پامالی اور ایک غیر فطری حالت مسخ و انقلاب کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ وقت تفصیل کا نہیں۔ اشارات پر اکتفا کیجئے اور ٹھیک ٹھیک یہی معنی ہیں مسلم کی اس مشہور حدیث کے جس کی شرح میں عجیب عجیب حیرانیاں لوگوں کو پیش آئی ہیں کہ:

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ و ینصرانہ — دنیا میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اپنی اصل فطرت پر۔ پھر یہودی اسے یہودی بنا لیتے ہیں اور نصرانی نصرانی۔

ایک دوسری روایت میں ہے: ما من مولود یولد الا وھو علیٰ ھذہ الملۃ۔ یعنی جس قدر

بچے پیدا ہوتے ہیں، سب ملت اسلام پر پیدا ہوتے ہیں۔

انسان کی فطرت صالحہ ہی کا نام اسلام ہے، اور ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، اپنی اصلی اور بے میل فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے، پس انسان کا ہر بچہ اسلام پر پیدا کیا گیا۔ اب وہ دنیا میں آتا ہے اور باہر کی ہوائیں اس کے اندر کی روشنی کو تہ و بالا کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہودیت کے اثرات اس نے پائے، تو یہودیت کا جھونکا اس کے چراغ فطرت کو گل کر دیگا، اگر مجوسیت کا طوفان اٹھا، تو اسی میں اس کی کشتی فطرت ڈگمگانے لگیگی۔ پر یہ جو کچھ ہوگا، باہر کا اثر و کسب ہے، اس کے اندر کی فطرت صرف اسلام تھی۔ یعنی صرف نیکی و خیر تھی۔

تمہید بڑھتی جاتی ہے اور یہ مبحث خود ایک مستقل صحبت ہے اگر اس بارے میں قرآن حکیم کی مزید تصریحات جمع کی جائیں تو صفحوں کے صفحے اسی میں صرف ہو جائیں۔ یہی معنی ہیں ذریت انسانی کے "بلی" کہنے کے جبکہ خدا نے ان سے پوچھا کہ الست بربکم؟ کیا میں ہی تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ پس انسان کی فطرت اصلی تصدیق ہے جو اس کے اندر ودیعت کر دی گئی اور اب اگر "بلی" کی جگہ یعنی تصدیق ربوبیت کی جگہ وہ انکار کرتا ہے۔ تو یہ اس کی فطرت کی صدا نہیں ہے۔ ایک غیر فطری صناعی ہے۔

اور اسی فطرت صالحہ کا نام قرآن حکیم نے "قلب سلیم" رکھا ہے یعنی وہ دل جو بالکل صحیح و سالم ہو اور اپنی اصلی تندرستی و اعتدال پر قائم ہو۔ کوئی نیا عارضہ اور بیماری اسے نہیں لگ گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت فرمایا کہ اذ جاء ربه بقلب سليم جبکہ وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم یعنی فطرت صالحہ غیر آلودہ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ تم کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم

کی یہ فطرت صالحہ وہ تھی جس کو باہر کا کوئی بڑا سے بڑا جلوہ بھی مرعوب نہ کر سکا اور اس کے اندر کی روشنی پکار اٹھی "انی وجهت وجهی للذی فطر السموٰت والارض حنیفاً وما انا من المشرکین۔"

اور یہی وجہ ہے کہ خدا کی شریعت کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس فطرت صالحہ پر انسان نے صناعی و خارجی ضلالت کا جو زنگ چڑھا دیا ہے اسے دور کر دے، اور اس کی اصلی روشنی پھر چمک اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہدایت الٰہی کو قرآن نے "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کیا، اور ضلالت و کفر کو "نسیان" کہا۔ "ذکر" کے معنیٰ حفظ اور یاد کے ہیں، نسیان بھولنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ فطرت اصلی کو انسان بھلا دیتا ہے اور اسی کا نام ضلالت ہے پس ضلالت نسیان ہوئی اور ہدایت فطرت اصلی کے بھلائے ہوئے سبق کو پھر تازہ کر دینا۔ اسی لئے اس کو ذکر کہا۔ نسیان کی انتہا "غفلت" ہے "غفلت" کو قرآن نے منتہائے ضلالت قرار دیا ہے۔ لهم قلوب لا یفقهون بها ولهم اعین لا یبصرون بها، ولهم اذان لا یسمعون بها، اولٰئک کالانعام بل هم اضل۔ اولٰئک هم الغافلون۔

ایک اور آیت بھی نسیان کے متعلق اس سرسری نظر میں سن لو:

الذین نسوا اللّٰه فانساهم انفسهم۔ وہ لوگ کہ انھوں نے اللّٰہ کے رشتہ کو بھلایا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے نفسوں ہی کو بھول گئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسوں کو یعنی اپنی فطرت صالحہ کو بھول گئے۔ کیونکہ فطرت صالحہ تو وہ تھی جس نے کہا تھا "بلیٰ" یعنی

خدا کی ربوبیت اور اس کے رشتے کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر وہ اس ہستی کے رشتے کو بھلا رہے ہیں جس کے آگے فطرت اصلی "بلیٰ" کہہ چکی ہے، تو اس رشتے کو نہیں بھلا رہے بلکہ اپنی فطرت ہی کو بھلا رہے ہیں۔

عود الی المقصود

بہرحال قرآن حکیم انسان کی فطرت کو خالص نیکی قرار دیتا ہے، اور بدی سے اس کی فطرت صالحہ کو پاک تبلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی فطرت صرف تندرستی اور صحت ہے۔ البتہ وہ دنیا میں آکر بہت سی بیماریاں مول لے لیتا ہے۔ بیماری باہر کا اثر ہے، اندر صرف تندرستی ہے۔

سورۂ والتین کا موضوع اصلی یہی حقیقت ہے۔ یعنی اس میں انسان کی فطرت صالحہ کی اسی گم شدہ اصلیت کو واضح کیا گیا ہے، اس موضوع کے لئے قرآن نے مفصل درس بھی دئیے ہیں، لیکن یہ منجملہ مجمل مگر جامع و حاوی دروس کے ہے۔

پہلی صحبت میں مولانا نے یہاں تک مضمون لکھ کر شائع کر دیا۔ بقیہ حصہ مضمون ذیل میں درج ہے۔

گزشتہ صحبت میں یہ مسئلہ ایک حد تک واضح ہو چکا کہ سورۂ والتین کا موضوع اصلی فطرت صادقۂ انسانی کے شرف و خیریت کا اعلان ہے، اور یہ تبلاتا ہے کہ انسان نے اپنی حقیقت و فطرت کے متعلق جس قدر مایوس فیصلے کئے ہیں وہ سب غلط ہیں، نہ تو اللہ نے اس کی فطرت کو شر اور بدی کے لئے بنایا ہے اور نہ اس کی حقیقت اس قدر حقیر و ذلیل ہے کہ وہ کائنات ہستی

کے ہر وجود ظہور کے آگے جھک جائے، اور انکے کرشموں کے سامنے اپنے تئیں حقیر و لاچار سمجھ لے۔ اگر وہ اپنی فطرت صادقہ کو عمل غیر صالح سے پامال نہ کرے تو وہ دنیا میں بڑی سے بڑی عظمت حاصل کر سکتا ہے۔

اس موقعہ پر اس قدر اور سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان کا اپنی فطرت صادقہ کی حقیقت سے بے خبر رہنا، در اصل اس کی تمام ناکامیوں کی اصلی جڑ ہے۔ کائنات عالم کے دائرۂ حقیقت کے لئے اس کا وجود بمنزلۂ ایک نقطہ و مرکز کے ہے، پس جب تک انسان اپنے نفس کی حقیقت کو نہیں پائیگا، وہ تمام عالم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا، اور حقیقت کو نہیں پا سکتا تو اپنی تخلیق کی غرض و مقصد کو بھی پورا نہیں کر سکتا۔ سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ وہ سمجھے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس کے لئے ہے، وہ کسی کے لئے نہیں ہے لیکن اپنے شرف و عظمت اور خیریت و حرمت کے احتجاب نے اس حقیقت تک پہنچنے نہ دیا۔ وہ کائنات عالم کے ادنیٰ ادنیٰ جلووں سے مرعوب و ہیبت زدہ ہو گیا، اور سمجھنے لگا کہ جب بجلی کی چمک مجھ سے بڑی ہے، سمندر کا طوفان مجھ سے زیادہ قہار ہے، شیر کا پنجہ مجھ سے زیادہ قوی ہے، ہاتھی کا وجود مجھ سے زیادہ عظیم ہے حتیٰ کہ مچھر کی ڈنک اور رینگنے والے زہریلے کیڑوں کا زہر بھی میرے لئے سخت خوفناک ہے، تو پھر میری ہستی کیا ہے اور مجھ میں کونسی بڑائی ہو سکتی ہے؟ اسی خیال کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے اینٹ اور پتھر تک کی پوجا شروع کر دی، اور دوسری طرف اپنے وجود کو اس قدر ذلیل سمجھ دیا، کہ جھکنے، گرنے، لوٹنے، پوجنے،

اور بندگی کرنے کے لیئے اس کے اندر ایک قوی اور دائمی استعداد پیدا ہوگئی۔
اس صناعی و خارجی ضلالت سے ہر قوت نے غیر فطری فائدہ اٹھایا، اور جب چاہا ایک ادنیٰ کرشمۂ قوت دکھلا کر اس کے جسم و دماغ کو اپنے آگے جھکا دیا۔
تحقیر و تذلیل نفس انسانی کی یہ انتہائی حالت اسی کا نتیجہ تھی کہ اس نے اپنی فطرت کی خبریت کو نہ سمجھا اور ہمیشہ اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ اس نے چارپایوں کو دیکھا اور سانپوں اور بھیڑیوں کی درندگی و خونفاکی پر نظر ڈالی، پھر اسی طرح اپنی نسبت بھی فیصلہ کر لیا کہ اس میں بدی اور بہیمیت کے سوا کچھ نہیں ہے، اور اگر نیکی کا جزو ہے بھی، تو وہ بدی کے ساتھ ممزوج و مخلوط ہے۔
یہ تنزل انسانی کی اصلی علت اور انسانیت اعلےٰ اور خلقت کبریٰ کی گم شدگی تھی۔
سورۂ والتین نے اسی کا سراغ بتلایا ہے۔ پس فی الحقیقت اسکا موضوع انسانیت اعلےٰ کا اعلان ہے۔
انسان کے اندر جو کچھ ہے۔ وہ اس کا نفس ہے باہر جو کچھ ہے وہ آفاق ہے
قرآن حکیم نے جا بجا اسے تنبیہ کی ہے۔ کہ اپنے اندر بھی دیکھے۔
اور اپنے سے باہر کو بھی سمجھے۔ یعنی انفس اور آفاق دونوں پر تفکر کرے۔

سنریھم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔
(حٰم السجدہ ع ۶) عنقریب وہ اللہ کی نشانیاں آفاق اور انفس میں یعنی اپنے سے باہر اور اپنے اندر دیکھینگے۔ یہ مشاہدہ حقیقت اصلی کو ان پر کھول دیگا اور وہ پالینگے کہ بلاشبہ دین الٰہی کی دعوت حق ہے۔ دوسری جگہ زور دیا وفی انفسکم افلا تبصرون۔ تم اپنے اندر نہیں دیکھتے کہ کیا ہے۔ اگر تم دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ شریعت الٰہی کوئی نئی چیز تم سے

نہیں چاہتی۔ تمہاری فطرت اصلی ہی کا ظہورِ خالص چاہتی ہے۔ اسی کا نام دین قیم ہے۔

استشہاد و طریق استشہاد

سورۂ والتین نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے اور اس پر شہادت پیش کی ہے۔ بیان، بمنزلۂ دعویٰ کے ہے، اور شہادت اس کی دلیل ہے۔ دعویٰ تمہیں معلوم ہو چکا: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا ہے۔ اب دلیل کا حصہ باقی ہے، لیکن قبل اس کے کہ دلائل پر نظر ڈالیں، اس پر غور کر لینا چاہیئے کہ اس غلطی کا اصلی سبب کیا تھا، جس کو سورۂ والتین دور کرنا چاہتی ہے؟

اس کا اصلی سبب اعمال انسانی کی رنگارنگی اور بوقلمونی تھی۔ انسان نے جب اپنے آپ کو دیکھنا چاہا تو اپنی فطرت کو نہ دیکھ سکا کہ وہ محجوب و مستور ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اعمال و افعال کو دیکھا اور ان کے اندر ایک عجیب متضاد اختلاف نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ نیکی اور بدی دونوں باہم دست و گریبان ہیں۔ اگر ایک طرف اس کے اندر نیکی و شرافت کے رقیق و لطیف جذبات نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف درندگی و بہیمیت کی خوفناکی بھی نظر آتی ہے۔ اگر وہ فرشتوں کی طرح محبت و احسان کی آنکھیں رکھتا ہے، تو بھیڑیوں اور بچھوؤں کی طرح اس کے پاس حرص و غرض کا پنجہ اور خونریزی

وسفاکی کی زہریلی ڈنک بھی ہے۔ اگر ایک طرف پادشاہوں کے زرنگار تخت، اور حکموں اور فرمانروائیوں کی عظمت وکبریائی نظر آتی ہے جو انسانی عظمت وجلال کی شہادتیں دے رہی ہیں، تو انہی کے سامنے غلاموں کی پا بزنجیر صفیں بھی دست بستہ کھڑی ہیں جو انسان کو کتے اور بلی سے بھی زیادہ حقیر ثابت کر رہی ہیں، کیونکہ نہ تو کتے نے اپنے جیسے کتے کے آگے سر جھکایا اور نہ بلی نے کبھی بلی کو سجدہ کیا۔

اس نے دیکھا کہ یہی انسان حاکم بھی ہے محکوم بھی، ساجد بھی ہے مسجود بھی، عالم بھی ہے جاہل بھی، عاقل بھی ہے ابلہ بھی، نیک بھی ہے بد بھی، شہنشاہی کا تخت، حکمرانی کا فرمان، فتحمندی کی تلوار، نیکی کی فرشتگی، اور سچائی کی قدوسیت بھی وہی ہے۔ اور غلامی کی خاک، محکومی کی ذلت، مقتولی کی گردن، بدی کی شیطنت، اور شر کی رذالت بھی اور کوئی نہیں!

یہی انسان ہے جو رات کو دروازوں پر پاسبانی کرتا ہے تاکہ اس کے ہم جنس گھر کے اندر امن سے سوئیں، اور یہی انسان ہے کہ دوسرے طرف سے آکر مکان میں نقب بھی لگاتا ہے تاکہ اپنے ہمجنسوں کو دکھ اور نقصان پہنچائے۔ اگر عبادت گاہوں کے اندر فرشتے نہیں آتے بلکہ انسان ہی ہوتے ہیں، تو ڈاکوؤں کے جتھوں کے اندر بھی بھیڑیے جمع نہیں ہوتے بلکہ آدم ہی کی اولاد ہوتی ہے۔

پس اعمال انسانی کی اس رنگارنگی اور نور وظلمت کے اس اختلاط کو دیکھ کر وہ اس دھوکے میں پڑ گیا کہ جس مخلوق کے اعمال کا یہ حال ہے

اس کی فطرت کا بھی یہی حال ہوگا۔ اگر وہ اپنے اعمال کے اندر نیکی اور بدی اور عظمت و ذلت دونوں رکھتا ہے، تو اس کی فطرت کے اندر بھی نیکی و بدی اور فوز و خسران دونوں ہونگے۔ اگر وہ اپنے اعمال اور نتائج اعمال کے اندر عظمت کا تخت اور ذلت کی بندگی، دونوں جلوے دکھلاتا ہے، تو اپنی فطرت کے اندر بھی طاقت و تسلط اور مقہوریت و مخذولیت، دونوں رکھتا ہوگا۔

اسنے اعمال کو دیکھ کر فطرت کے لئے حکم لگانا چاہا، اور اس نے افراد کی حالت کو دیکھ کر نوع کے لئے فیصلہ کر دیا۔ اسی غلطی نے اس کے اندر یہ عقیدہ پیدا کیا کہ ہم صرف برائی اور نیکی ہی کے لئے نہیں ہیں جیسا کہ بعض افراد نظر آتے ہیں، بلکہ حقیر ہونے اور برے رہنے کے لئے بھی ہیں جس طرح کہ اکثر افراد شہادت دیتے ہیں۔ پس نیکی اور برائی دونوں کے لئے اس میں ایک مایوس قناعت پیدا ہوگئی، اور اس غیر صالح قناعت نے عزم اور ہمت کی پیاس کو بالکل بجھا دیا۔ ایک غلام ساری عمر غلامی اور بندگی میں خوش خوش گذار دیتا ہے، اور کبھی اس کے اندر یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ میں بھی ویسا ہی انسان ہوں جیسا میرا آقا، پھر میں کیوں صرف بندگی کے لئے ہوں اور یہ کیوں آقائی کیلئے؟ ایک محکوم قوم ویسی ہی خوشی اور سکھ کے ساتھ غلامی کی خاک پر لوٹتی ہے، جس طرح ایک حاکم قوم عزت و عظمت کے تخت پر فرمانروائی کرتی ہے، اور کبھی اس کے اندر یہ بیقراری نہیں اٹھتی کہ ہم بھی انسان ہیں، ہمارے پاس بھی وہ سب کچھ ہے جو ان حاکموں کے پاس ہے، پھر ہم کیوں ذلت کے لئے ہیں اور یہ کیوں عظمت و

فرمانروائی کیلئے؟ ہزاروں مزدور ہیں جو کارخانوں میں پھرکیوں کی طرح چکر کھاتے ہیں اور اس میں اتنے ہی خوش ہوتے ہیں جس قدر کارخانہ کا مالک۔ لیکن کبھی ان میں یہ تڑپ نہیں اُٹھتی کہ اگر ہم بھی چاہیں تو کارخانہ کے مزدور کی جگہ کارخانے کے مالک بن سکتے ہیں، اور یہ کیا ہے کہ ہماری ہی طرح انسان ہمارے مالک بن گئے؟ پھر اسی طرح دیکھو کہ ہزارہا انسان ہیں جو طرح طرح کی بدیوں اور خباثتوں کی گندگیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں؛ مگر کبھی نہیں سوچتے کہ نیک و پاک انسان بھی آخر ہمارے ہی طرح انسان ہیں؛ یہ کیوں ہے کہ وہ نیک ہیں مگر ہم نیکی کے لئے جنبش نہیں کر سکتے؟

ہر طرح کی مثالیں سامنے لاؤ، اور ادنیٰ و اعلیٰ حالتوں کے اختلاف کے جس قدر پہلو ہو سکتے ہیں، ان سب پر نظر ڈالو۔ تم پاؤ گے کہ پستی و ذلت اور بدی و شرارت کی ہر زندگی کے اندر ایک باطل قناعت اور قابل بے حسی پیدا ہو گئی ہے؛ اور یہی قناعت و بے حسی قوتوں کو پامال اور انسانیت اعلےٰ کی تمام بڑی سے بڑی طاقتوں کو ضائع کر رہی ہے۔

اب غور کرو کہ یہ حالت کیوں پیدا ہوئی؟ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نظر نہیں آئیگا کہ چونکہ انسان کے اعمال اور اس کے ثمرات متضاد اور مخلوط ہیں، اور اکثر حالتوں میں پستی و ناکامی کے نمونے زیادہ اور عظمت و کامرانی کے امثال کم ہیں، اس لئے ہر نامرادی کی حالت میں انسان نے نامرادوں پر نظر ڈالی۔ اور ہر برائی کی زندگی میں بسنے والوں کو دیکھا یعنی نامرادوں کو دیکھ کر اپنی نامرادی پر گرے ہوؤں کو دیکھ کر اپنی گری ہوئی حالت پر بہتوں کو دیکھ کر اپنی برائیوں پر وہ ایک طرح کا استدلال کر رہا تھا۔

اور ان سے شہادت لاکر اپنی حالت کو فطری اور لابدی سمجھنے لگا۔ اس غلط استشہاد نے اس کے اندر غلط قناعت پیدا کی، اس کے احساس کو فنا کر دیا، اس کی طلب بجھ گئی، اور وہ اپنی ذلت و برائی کو اصلی اور شدنی چیز سمجھ کر ایک بناوٹی خوش حالی میں مبتلا ہو گیا۔ غلام کے اندر آقا بننے کا کیوں جوش نہیں اُٹھتا؟ اس لئے کہ وہ اپنے جیسے غلاموں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ صرف میرے ہی لئے نہیں ہے بلکہ سب کے لئے ہے، اور اس لئے ایک قدرتی چیز ہے جس پر صرف صبر ہی کر لینا چاہئے۔ پس اس نے غلاموں پر نظر ڈالی اور غلاموں سے اپنی غلامی پر شہادت لایا۔ اگر وہ غلاموں کی جگہ آقاؤں کو دیکھتا اور ان سے شہادت لیتا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں اور اسی کرۂ ارضی کی پیٹھ پر بستے ہیں، تو فوراً اس کا احساس مردہ زندہ ہو جاتا، اور اپنی فطرت کے شرف و خیریت کو پا لیتا ایک مزدور کیوں اسی میں خوش ہے کہ اٹھارہ گھنٹے کی محنت کے معاوضہ میں صرف ایک روٹی پائے؟ اس لئے کہ وہ اپنی ادنیٰ حالت کے لئے اپنے ہی جیسی ادنیٰ حالت کے مزدوروں کو دیکھتا اور ان سے استشہاد کرتا ہے اگر وہ ان سے استشہاد کرتا جن کی وہ مزدوری کرتا ہے تو اُس کے اندر بھی ولولۂ عزم و طلب پیدا ہوتا۔ ایک انسان کس طرح برائی میں اپنے اندر تسکین و قناعت پیدا کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ وہ بُروں ہی کو دیکھتا ہے اور انہی سے استشہاد کر کے سمجھ لیتا ہے کہ انسان اس لئے بھی بنایا گیا ہے کہ برائی کرے جیسا کہ سب کر رہے ہیں، اور جب سب

کر رہے ہیں تو وہاں ایک اور سہی :

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود ؛

ز زہد ہمچو توئی یا بہ فسق ہمچو منی !

پس حاصل مبحث یہ ہے کہ انسان نے فطرت انسانی کی حقیقت خیریت کے سمجھنے میں غلطی کی اس لئے کہ اس نے :

(۱) اعمال انسانی کو خیر و شر اور عظمت و ذلت کا مجموعہ دیکھا۔

(۲) پس وہ سمجھا کہ انسان کی فطرت میں بھی خیر و شر اور ذلت و عظمت دونو ہیں۔

(۳) اس نے اعمال کی راہ سے فطرت کو دیکھنا چاہا اور افراد کی حالت کو دیکھ کر نوع کو بھی اسی پر قیاس کر لیا۔

(۴) اسی اعتقاد کا اثر اس کے تمام اعمال حیات میں پڑا۔ جب اس نے انسانی فطرت کو خیر و شر کا مجموعہ سمجھ لیا تو اس کے اندر شر و تسفل کی حالت میں ایک گمراہ قناعت پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگا کہ جب برائی فطرت ہی میں ہے تو نیکی کا نہ ہونا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر افسوس کیا جائے، اور جس کے لئے اچنبھا ہو۔

اس کی یہ حالت دراصل ایک استشہاد و استدلال ہے جو وہ تمام ادنیٰ و سافل حالتوں کے افراد سے کرتا، اور عموماً اعمال شر و تسفل کو اپنے سامنے لاتا ہے۔

سورۂ والتین کے مطالب کی ترتیب

سورۂ والتین کا موضوع، اور مسئلہ خیر و شر فطرت کے متعلق انسان کی غلطی کے اصلی اسباب معلوم ہو گئے۔ اب دیکھو کہ سورۂ والتین نے اس حقیقت کے اظہار و ثبوت کے لئے مطالب کی ترتیب کیا اختیار کی ہے؟

(۱) اس نے دعویٰ کیا کہ انسان کی فطرت ہم نے نیک و صالح پیدا کی ہے۔ وہ صرف شرف و عظمت کے لئے ہے۔ اس کو بہترین حالت عدل پر ہم نے پیدا کیا ہے اور عدل ہی خیر کی حقیقت ہے: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

(۲) ساتھ ہی اس نے اس غلطی کا ازالہ کیا جس کی وجہ سے انسان نے اپنی فطرت کے متعلق ایسی عظیم الشان غلطی کی۔ اس کی بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ انسان کی فطرت کے معلوم کرنے کے لئے انسان کے اعمال کو دیکھتا ہے، اور برے انسانوں کو دیکھ کر فطرت کی برائی پر استشہاد کرتا ہے۔ پس سورۂ والتین نے انسانی اعمال کی عظمت و جبروت کے لئے انسان کی عظمت و شرف سے استشہاد کیا، اور یہ کہا کہ تم گرے ہوؤں کو دیکھ کر اپنی فطرت کو کیوں گرا ہوا سمجھتے ہو؟ ان کو نہیں دیکھتے جو گرنے کی جگہ بلند ہوئے؟ یہ لوگ جو فطرت صادقہ کو قائم رکھ کر بلند

ہوئے، وہی لوگ ہیں جن کی طرف والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین کے تین جملوں میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہی وہ انعام یافتۂ الٰہی گروہ ہیں جن کی راہ صراط مستقیم ہے اور جن کی راہ کی طلب سورۂ فاتحہ میں سکھلائی گئی ہے: صراط الذین انعمت علیھم ان کی راہ جن پر خدا نے انعام کیا۔ یہی حزب اللہ ہے۔ یہی اولیاء اللہ ہیں۔ یہی خیر البریہ ہیں، یہی البصیر ہیں، اور یہی اصحاب الجنۃ ہیں۔

(۳) رہا اعمال انسانی کی بوقلمونی اور خیر و شر کا سوال تو یہ اس لئے نہیں ہے کہ انسان کی فطرت برائی ہے۔ اس کی فطرت تو عدل و خیر ہی ہے، البتہ وہ جب اس کو ضایع کر دیتا ہے اور اعمال سافلہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو جس طرح اس کی خلقت سب سے اعلیٰ تھی، اسی طرح اس کا اکتساب عمل اس کو سب سے زیادہ ادنیٰ بھی بنا دیتا ہے حتیٰ کہ اپنی حقیقت انسانی کو مسخ کر کے بسا اوقات چارپایوں اور درندوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ تم یہ حالت مسخ دیکھ کر کہتے ہو کہ یہ فطرت ہے، مگر نہیں سمجھتے کہ فطرت نہیں، خارج کا کسب عمل ہے۔ پس اعمال انسانی میں خیر و شر اور عظمت و تسفل جو تمہیں نظر آتا ہے، اس میں تفریق کرو۔ نیکی و عظمت اس کی خلقت ہے، اور شر و تسفل اس کی ضلالت عمل اور ضیاع فطرت۔ یہ اس کا عمل ہی ہے جس نے اسے چارپایوں سے بھی بدتر بنا دیا ہے: ثم رددناہ اسفل سافلین: اسفل سافلین یعنی ادنیٰ سے بھی ادنیٰ تر حالت تک گرے ہوئے وہی ہیں جن کا نام مغضوب اور ضالین ہے۔ پھر حزب الشیطان، اولیاء الطاغوت، شر البریہ،

الاعمیٰ اور اصحاب النار بھی وہی ہیں۔

(۴) یہ غلطی اس لئے ہے کہ تم اللہ کے قانون جزا و مکافات سے بیخبر ہو۔ اس کا قانون ہے کہ ہر بیج پھل لاتا، اور اسی طرح انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ زہر جب کھایا جائیگا انسان مریگا، اور معصیت جب کبھی کی جائیگی عذاب آئیگا۔ پس اعمال کے جزا ہی سے تمام نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اگر تمہارے اعمال فطرت صالحہ یعنی دین الٰہی کے مطابق ہیں اور تم نے اس کو ضایع نہیں کیا ہے، تو تم اپنی فطری بڑائی اور نیکی حاصل کروگے، اگر تم نے ضائع کردیا تو پھر تم مسخ ہوجاؤگے اور تم سے بُرا جانور زمین کی پیٹھ پر اور کوئی نہ ہوگا۔ جانور نے اپنی اصلی فطرت کو ضائع نہیں کیا وہ سافل ہے۔ تم نے اپنی فطرت ہی کو ضایع کردیا، پس تم سافلوں سے بھی اسفل اور بد سے بھی بدتر ہوگئے!"

(۵) پس جن لوگوں نے اپنی فطرت کو عمل غیر صالح سے ضایع کردیا وہ انسانیت سے گر گئے، مگر جنہوں نے ایمان باللہ سے انکار نہ کیا اور ایسے اعمال اختیار کئے جو صالح ہیں اور اس لئے نور فطرت کو قائم رکھنے والے اور چمکانے والے ہیں، سو وہ اعلےٰ سے اعلےٰ مراتب انسانیہ تک فائز ہوئے، اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ اس دوسری جماعت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے عمل صالحہ کا درخت ہمیشہ پھل دیگا۔ ان کے نتائج حقہ کی برکتیں اور نعمتیں کبھی بھی ختم نہ ہونگی۔ وہ اسفل سافلین کی حالت میں نہ ہونگے۔ کہ فنا اور ہلاکت ان پر طاری ہو۔ وہ "شجرۃ خبیثۃ" نہیں ہیں "شجرۃ طیبۃ"

ہیں۔ لہٰذا فرمایا: فلهم اجر غیر ممنون!

اصل تفسیر

اب اصل سورت کی یکجا تلاوت کرو:

والتین والزیتون وطور سینین انجیر اور زیتون طور سینا اور مکہ معظمہ شاہد ہیں وهذا البلد الامین ۔ لقد خلقنا کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل الانسان فی احسن تقویم ۔ پر پیدا کیا۔ پھر اسکو بد سے بدتر حالت میں ثم رددناه اسفل سافلین ۔ الا پھینک دیا۔ مگر وہ لوگ کہ ایمان لائے اور الذین امنوا وعملوا الصالحات عمل صالح کئے تو ان کے اعمال کے نتائج فلهم اجر غیر ممنون ۔ فما یکذبک صرف بہتری ہی کے لئے ہیں۔ ان کے عمل صالح بعد بالدین ۔ الیس الله باحکم الحاکمین ۔ کا بدلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ ہمیشہ پھل دیگا پس اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد کون ہے جو اعمال کے نتائج سے انکار کریگا اور اس بارے میں رسول کی تعلیم کو جھٹلائیگا؟ کیا سب سے بڑا حکم کرنے والا خدا ہی نہیں ہے جس کے قانون جزا و سزا میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی؟

تفصیل استشہاد

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد دین الٰہی کا سلسلہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ

علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے، اور ظہور اسلام اسی کا آخری مکمل ظہور ہے
حضرت ابراہیم کی نسل سے بنو اسرائیل پیدا ہوئے جن کے احیاء کے لئے
حضرت موسیٰ کی دعوت کا ظہور ہوا اور انہوں نے بنو اسرائیل کو مصریوں
کی غلامی سے نکال کر عزت و خلافت کے درجہ پر پہنچا دیا۔ ان کے بعد
جب بنو اسرائیل نے پھر اللہ کے احکام سے سرتابی کی۔ اور اصلاح کی
جگہ افساد کا طریق اختیار کیا تو روز بروز تنزل و تسفل میں مبتلا ہونے لگے،
پس انبیاء مجددین کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ یکے بعد دیگرے اصلاح کرتے
رہے۔ لیکن سلسلۂ تنزل بھی برابر بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وراثت ارضی سے
بنو اسرائیل محروم ہوگئے اور ان پر یکسر تباہی و بربادی طاری ہوگئی۔ اس
وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا ظہور ہوا، جن پر چند غریب
اور فاقہ مست انسان ایمان لائے، لیکن اللہ نے انہی غریب مچھوؤں اور
فقیروں کو یہ درجہ دیا کہ ان کی دعوت و تبلیغ عالم میں پھیلی، اور تمام روم
و یونان میں مسیحی مذہب پھیل گیا۔

پس انسان کے اعمال عظیمہ وصالحہ کے ان مظاہر کے تین قرنہی درجے
ہوئے:

(۱) دین الٰہی کی وہ بنیاد جو بیابان حجاز میں حضرت ابراہیم و اسماعیل
علیہما السلام نے ڈالی، اور اس کی اینٹیں رکھتے ہوئے امت مسلمہ کے
ظہور کی دعا مانگی:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ اور جب حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ

واسماعیل: ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (بقرہ: ۱۲۷) — خانہ کعبہ کی بنیادیں رکھ رہے تھے، تو ان کی زبانوں پر یہ پاک دعا جاری تھی: اے پروردگار! ہمارے اس کام کو قبول کرلے۔ تو دعاؤں کا سننے والا ہے اور تو ہماری نیتوں کو خوب جاننے والا ہے!

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول کیا، نسل اسماعیلی سے امت مسلمہ کا ظہور ہوا، اور وہ آخری معلم ربانی آگیا جس نے تعلیم کتاب وحکمت اور تربیت وتزکیۂ الٰہی سے جماعت مومنین پیدا کردی۔

(۲) دعوت موسوی کی وہ روشنی جو طور سینا پر چمکی اور وادی ایمن کے بقعۂ مبارکہ سے "انی انا اللہ رب العلمین" کی صدائے حق اٹھی:

فلما اتٰھا نودی من شاطیٔ الواد الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یموسٰی ! انی انا اللہ رب العلمین !! پس جب موسیٰ کوہ طور کے پاس پہنچے تو وادی ایمن کے کنارے کہ زمین کا ایک مبارک حصہ تھا، درخت سے ندا آئی: اے موسیٰ! میں ہوں تمام جہانوں کا پروردگار!

یہی کوہ طور کی وادی ایمن کی روشنی تھی جس نے بنو اسرائیل کو ظلمت تنزل وتسفل سے نجات دلائی، اور عظمت وخلافت الٰہی کے درجہ تک مرتفع کیا۔

(۳) دعوت مسیحی کا وہ ظہور جو سلسلۂ اسرائیلی کا آخری ظہور تھا اور جو بیت المقدس کی سرزمین میں ہوا:

فامنت طائفۃ من بنی اسرائیل - پس بنو اسرائیل کی ایک جماعت اس پر ایمان

وکفرت طائفۃ فایدنا الذین اٰمنوا لائی اور ایک جماعت نے انکار کیا۔ مومنوں کو علیٰ عدوھم فاصبحوا ظاہرین! ہم نے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان والوں کی کامیابی اور فتحمندی ظاہر ہوگئی۔

قرآن حکیم کی مخاطب جو جماعتیں تھیں، ان کی معلومات میں بھی انسانی عظمت و قدوسیّت کے بالاتفاق یہی تین جلوے تھے۔ اہل کتاب حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا تھے، اور مشرکین مکہ کا بڑا ادعائی شرف یہ تھا کہ اپنے تئیں حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کریں۔

پس سورۂ والتین میں سعادت انسانی کے انہیں تین ظہوروں سے انسان کی فطرت صالحہ و عظمت و شرف پر شہادت لائی گئی ہے "تین اور زیتون" سے مقصود سرزمین شام ہے جہاں حضرت عیسیٰ کا ظہور ہوا اور جو تمام انبیاء مجددین اسرائیل کا مقام ظہور ہے "طور سینین" سے اشارہ دعوت موسوی کی طرف ہے جس کی تجلی کا مطلع اسی مقدس پہاڑ کا دامن تھا۔ "بلد امین" یعنی ہمیشہ امن میں رہنے والا گھر خانۂ کعبہ ہے، اور اس میں اشارہ حضرت ابراہیم کی دعوت موسسۂ ابراہیمیہ اور اس کے نتائج کی طرف ہے۔

استشہاد کی ترتیب شاخ سے اصل کی طرف، نسل سے مورث کی طرف فاضل سے افضل کی طرف، اور حسن سے احسن کی طرف ہے۔ یعنی ظہور سعادت انسانی کے اس سلسلہ میں افضل ترین بنیادی مرتبہ دعوت ابراہیمی کا ہے۔ اس کے بعد مرتبۂ قیام شریعت موسوی کا، اس کے بعد مرتبۂ تجدید انبیاء بنی اسرائیل کا عموماً اور حضرت عیسیٰ کا خصوصاً۔ (علیٰ نبینا

وعلیہم الصلوٰۃ السلام) پس ترتیب جڑ سے شاخ کی طرف نہیں ہے بلکہ شاخ سے جڑ کی طرف ہے اور اس میں بالترتیب تینوں درجوں کے مراتب یکے بعد دیگرے ملحوظ رکھے گئے ہیں چونکہ سب سے آخری ظہور مسیحی سب سے زیادہ قریب تھا، اس لئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا، اس کے بعد اس سے اعلےٰ مرتبہ دعوت موسوی کا تھا، پس اس کا ذکر کیا، پھر سب سے اعلےٰ ترین مرتبہ بمنزلہ اصل وحقیقت الحقائق کے مقام خلت کبریٰ حضرت ابراہیم کا تھا، پس اس پر مدارج ثلاثہ ختم ہو گئے۔

تین و زیتون

"تین و زیتون" سے سرزمین شام کا مراد لینا بالکل واضح ہے:

(۱) "طور سینا" اور "بلد امین" دونوں میں اشارہ اس سرزمین کی طرف کیا گیا ہے جہاں ان کی دعوتوں کا ظہور ہوا۔ پس معلوم ہوا کہ اس سورت میں سرزمین کی طرف اشارہ کر کے اس سرزمین کی مشہور دعوت و امت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اس بنا پر "تین و زیتون" میں بھی اشارہ کسی سرزمین ہی کی طرف ہوگا جیسا کہ مابعد کی دو شہادتوں میں ہے۔

(۲) دنیا کی تمام سرزمینوں میں اُس وقت بھی جبکہ قرآن حکیم نازل ہوا اور اب بھی جبکہ ملکوں کی طبعی پیداوار کی فہرست ہمارے سامنے موجود ہے، انجیر اور زیتون ایک مخصوص پیداوار سرزمین شام کی ہے جس کثرت

کے ساتھ اور جس قدر اعلیٰ درجہ کی یہ دونوں چیزیں وہاں ہوتی ہیں کہیں نہیں ہوتیں۔ زیتون کا تیل شام کی عام غذا ہے۔ گھی کی جگہ عام طور پر اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی اعمال کا اب تک یہ ایک مقدس جزو ہے۔ ان کے تمام مذہبی رسوم میں اسی تیل کو "مقدس تیل" کہا جاتا ہے۔ روم کے تمام عیسائی پادشاہ جب تخت نشین ہوتے تھے، تو مقدس تیل ان کے سینے پر لگایا جاتا تھا اور کہتے تھے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کا اتباع ہے۔ آج تک تاج پوشی کی رسم میں ایک پیالی روغن زیتون کی بھی رکھی جاتی ہے۔ قطع نظر ان تمام خصوصیات کے اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ تمام عرب میں یہ دو چیزیں شام کی مخصوص و ممتاز پیداوار سمجھی جاتی تھیں، اور اس قدر مشہور تھیں کہ بچہ بچہ جانتا تھا۔ اشارہ کے لئے یہ کافی ہے۔

(۳) پس جب تین و زیتون کا اشارہ بھی کسی ملک کی طرف ہونا چاہیئے اور وہ شام کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تو پھر یہ ظاہر ہے کہ شام کا سب سے بڑا آخری ظہور حق حضرت عیسیٰ کی دعوت ہے، اور ساتھ ہی یہ سرزمین تمام اسرائیلی انبیاء مجددین کے ظہور کا بھی گھر ہے۔

نیز چونکہ اس کے بعد ہی دعوت موسوی کی طرف اشارہ موجود ہے، اس لئے ربط بھی یہی چاہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی دعوت کی طرف بھی اشارہ ہو۔

(۴) سب سے زیادہ یہ کہ تین اور زیتون کی تفسیر کے متعلق صحابہ

کرام و تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جو روایات موجود ہیں، ان سب پر مجموعی نظر ڈالنے کے بعد یہی تفسیر مرجح ثابت ہوتی ہے، اور قرآن حکیم کی سب سے زیادہ صحیح تفسیر وہی ہے جو صحابہ کی تفسیر سے مطابق ہو کہ ان کے علوم حامل وحی سے براہ راست ماخوذ تھے۔

امام ابن جریر طبریؒ نے تمام روایتیں جمع کر دی ہیں۔ ان پر نظر ڈالو۔ سب سے پہلے حضرت کعب کا ایک قول سامنے آتا ہے کہ "التین مسجد دمشق والزیتون بیت المقدس" تین مسجد دمشق ہے اور زیتون بیت المقدس۔ پھر حضرت عبداللہ ابن عباس کی نسبت سے اس قول کی شہرت ثابت ہوتی ہے کہ "الزیتون بیت المقدس" یعنی زیتون بیت المقدس ہے۔

لیکن اس کے بعد بعض کبار تابعین کی تصریحات آتی ہیں جنہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ "ھو تینکم و زیتونکم"۔ یعنی تین اور زیتون سے یہی انجیر اور زیتون مراد ہے جو تم استعمال کرتے ہو۔ اور کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔ حضرت حسنؒ، عکرمہؒ، مجاہدؒ، قتادہ وغیرہ سب نے یہی کہا ہے۔

اب ان دونوں تفسیروں کو جمع کرو۔ جن صحابہ سے اس قول کو شہرت ہوئی کہ تین اور زیتون سے مراد مسجد دمشق اور بیت المقدس ہے، ان کا مقصود یہ نہ تھا کہ دمشق کی کسی عمارت کا نام تین ہے اور بیت المقدس کا نام زیتون، بلکہ یہ واضح کرنا تھا کہ تین و زیتون میں اشارہ سرزمین شام کی طرف ہے، کیونکہ وہاں ان دو چیزوں کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے اور

یہ اس کے خصائص میں سے ہیں یہ زیتون یعنی بیت المقدس سے مطلب یہ تھا کہ زیتون میں اشارہ بیت المقدس کی طرف ہے۔

لیکن بہت سے لوگوں کو اس میں غلطی ہوئی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ طور سینا کی طرح زیتون بھی بیت المقدس کے کسی پہاڑ کا نام ہے۔ اور پھر طرح طرح کی مزید تاویلیں اس میں بڑھ گئیں۔ یہ حال دیکھ کر بعض اجلۂ تابعین نے غلطی کو دور کرنا چاہا اور زور دے کر کہا کہ "ھو تینکم و زیتونکم" تین اور زیتون کسی پہاڑ یا ملک کا نام نہیں ہے وہ یہی انجیر اور زیتون کا درخت ہے جو تم استعمال کرتے ہو۔ گویا انہوں نے واضح کیا کہ تین و زیتون سے اس کی جائے پیدائش مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ خود اس سرزمین کا نام ہی تین و زیتون ہو۔

چنانچہ امام ابن جریر کا بھی قریب قریب یہی خیال ہے۔ تمام روایتیں جمع کر کے لکھتے ہیں :

والصواب من القول فی ذالک عندنا من قال التین ھو التین الذی یؤکل والزیتون ھو الزیتون الذی یعصر منه الزیت لان ذالک ھو المعروف عند العرب .... الا ان یقول قائل اقسم ربنا بالتین والزیتون۔	اس بارے میں ہمارے نزدیک انہی لوگوں کا قول ٹھیک ہے جنہوں نے کہا کہ تین وہی تین ہے جو کھایا جاتا ہے، اور زیتون وہی درخت ہے جس سے تیل نکلتا ہے۔ کیونکہ عرب میں یہ معروف تھا۔ اور اس نام کے کسی پہاڑ کو وہ نہیں جانتے تھے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کہے کہ اللہ

والمراد من الکلام القسم بمنابت نے تین اور زیتون کی قسم کھائی مگر مقصود اس
التین ومنابت الزیتون فیکو ن سے تین اور زیتون کی پیدائش کے مقامات
ذالک مذ ھبا - (جلد ۳۱: ۱۵۴) - کی قسم کھانا ہے - سو اگر یہ کہا جائے تو یہ ایک
مذہب ہوگا -

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ تین و زیتون سے یہی پھل اور درخت مراد لیتے ہیں، ان کو صرف اس سے انکار ہے کہ کسی ملک یا پہاڑ کا نام تین و زیتون نہیں ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے - لیکن اس سے وہ انکار نہیں کرتے کہ ان چیزوں سے ان چیزوں کی پیدائش کی سرزمین مراد نہ ہو۔

احسن تقویم

"احسن تقویم" میں "تقویم" ٹھیک ٹھیک بمعنی تعدیل کے ہے - یعنی ہم نے انسان کو بہترین قوام و عدل پر پیدا کیا - تعدیل خلقت میں جسم اور فطرت، ظاہر و باطن، سب داخل ہیں - اور جن صحابہ و تابعین سے "فی اعدل خلق و احسن صورۃ" بکثرت منقول ہے، اور نیز جو صحابہ استقامت صورت و جسم کو پیش کر کے حقیقت تعدیل خلقت کو سمجھانا چاہتے ہیں، ان سب کا مقصود یہی تعدیل فطرت ہے اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں - کسی نے کہا کہ انسان کا قد دیکھو، کسی نے کہا جسم کا تناسب دیکھو، کوئی اور آگے بڑھا اور کہا کہ خلقت

کی تعدیل معنوی پر بھی نظر ڈالو۔ تعدیل کا ایک بڑا نمونہ انسان کا قد ہے،
اس کی بڑی نمود اس کے تناسب اعضاء جسم میں ہے، اور پھر اس کی فطرت
عدل و قوام صالح پر پیدا کی گئی ہے۔ پس سب نے ایک ہی حقیقت کو
واضح کیا اور اسی کو مختلف تعبیرات سے سمجھانا چاہا۔

حضرات ۔ چونکہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر صفحہ
۵۹ پر ختم ہو گئی ہے۔ اور صرف اسی قدر مضمون کا شائع کرنا مناسب
نہیں سمجھا گیا۔ لہذا ہم چند صفحے اور بڑھا دیتے ہیں۔ اور شائقین کی
دلچسپی کے لیئے امام المفسرین، سند المحدثین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز
صاحبؒ دہلوی کی تفسیر سورۂ والتین، پیش کرتے ہیں۔ تمام مضامین
میں سے ہمیں یہی انتخاب پسند آیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اس جلیل
القدر خاندان کے ایک ممتاز رکن ہیں جس نے سب سے پہلے
ہندوستان میں کتاب و سنت کی اشاعت کا دروازہ کھولا۔ تاریخ
اسلام میں کسی خاندان کی نظیر نہیں ملتی۔ جس نے اس خاندان کی
طرح صدیوں تک نسلاً بعد نسلٍ کتاب و سنت کی اشاعت کے
بارِ گراں کو سنبھالا ہو۔

تفسیر سورۃ التین

از حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ

یہ سورہ مکی ہے۔ اس میں آٹھ آیتیں اور چونتیس کلمے اور ڈیڑھ سو حرف ہیں اور اس سورۃ کا نام سورۂ تین اس واسطے رکھا ہے کہ تین عرب کی لغت میں انجیر کے پھل کو کہتے ہیں۔ اور انجیر فائدہ بخشنے اور خوبیوں میں سب میووں سے جامع ہے جیسے آدمی کا بدن سب بدنوں سے جامع ہے اور اسی جامعیت کے سبب سے مستحق فیضان روحی کا ہوا ہے کہ جامع کمالات کا ہے پس مشابہ ہے قرآن کے لفظوں کے ساتھ کہ سمیٹنے والے بہت سے اسراروں کے ہیں۔ اور اس سورۃ میں ثابت کرنا شرع اور معاد کا یعنی آخرت کا کمال تاکید کے ساتھ منظور ہے۔ اسی واسطے اس سورۃ کی ابتداء میں چار قسمیں مذکور ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

وَالتِّیْنِ قسم ہے انجیر کی اور انجیر کو اور میووں سے ایک خصوصیت ظاہری ہے اور ایک خصوصیت باطنی۔ سو جو ظاہری خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ وہ غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے اور میوہ بھی ہے اسواسطے کہ وہ ایک چیز ہے لطیف سریع الہضم ملیّن طبع اور سڑے مواد کو بدن کے اندر سے پسینے کی راہ نکال دیتا ہے اسی واسطے اوجو

حرارت کے تپ کو مفید پڑتا ہے۔ اور بلغم کو تحلیل کرتا ہے اور گردے اور مثانے
کو سنگریزے سے پاک کر دیتا ہے اور بدن کو موٹا کرتا ہے اور مسام کو کھول دیتا
ہے۔ اور دفع کرنے میں کہد اور طحال کے سدّوں کے بے نظیر ہے اور ایک عجائبات
اِس میوے کے یہ ہے کہ سب کھانے میں آتا ہے کوئی چیز پھینکنے کے لائق نہیں
رکھتا۔ قرآن کی طرح بالکل مغز ہی مغز ہے نہ ایسا چھلکا رکھتا ہے کہ کھانے
میں نہ آوے نہ گٹھلی رکھتا ہے۔ کہ پھینکی جاوے اور حدیث شریف میں وارد ہے
کہ ایک شخص آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطے ایک طباق بھرا ہُوا انجیر
کا بطور ہدیے کے لایا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ اُن میں سے
نوش جان فرمائے۔ اور یاروں کو بھی ارشاد فرمایا۔ کہ کھاؤ کیونکہ یہ میوہ گٹھلی
نہیں رکھتا۔ اور بہشت کے میوے بھی ایسے ہی ہیں۔ سو اُس کو کھاؤ
کہ بواسیر کے مادّے کو دفع کرتا ہے اور نقرس کے درد کو مفید ہے اور حضرت
امام علی موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہمیشہ انجیر کھانا گندہ دہنی کو دفع
کرتا ہے اور سر کے بالوں کو بڑہاتا ہے اور فالج سے امن دیتا ہے۔ اور
عجائبات سے اِس میوے کے ایک یہ ہے کہ برابر لقمے کے بنایا ہے نہ چھوٹا
نہ بڑا تاکہ کھانے والے کو کسی طرح کی محنت اور مشقت نہ ہو اور وہ جو اِس کی
باطنی خصوصیتیں ہیں سو اُن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ میوہ کمال والوں سے
نہایت مشابہت رکھتا ہے۔ کہ ظاہر اور باطن اس کا یکساں ہے اس واسطے
کہ نہ گٹھلی رکھتا ہے نہ چھلکا بخلاف اور میووں کے کہ باہر کا اُن کے کھانے
کے لائق ہے اور اندر کا پھینک دینے کے قابل دوسرے یہ کہ اس

میوے کا عجیب درخت ہے۔ کہ اپنے کمال کو قبل ہونے کے ظاہر کرتا ہے کہ اوّل پھلتا
ہے اور پیچھے پھولتا ہے بخلاف اور میووں کے درختوں کے کہ اوّل اُن کے پھول
پتے نکلتے ہیں پھر پیچھے سے میوہ ظاہر ہوتا ہے گویا کہ یہ درخت صفت ایثار کی رکھتا
ہے کہ اوّل غیر کو فائدہ پہنچاتا ہے بعد اُسکے اپنی آراستگی اور فائدہ کی تدبیر کرتا
ہے۔ اور دوسرے درخت معاملہ دار لوگوں کی طرح سے ہیں کہ اوّل اپنا بھلا کر لیتے
ہیں اُس کے بعد اوروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور ایک یہ بھی ہے کہ جس قدر
فیض یہ میوہ رکھتا ہے اور میووں میں نہیں ہے کہ ایک سال میں کئی بار پھلتا
ہے۔ اور باوجود ان سب باتوں کے اس میوے کے درخت کو ایک بڑی مناسبت
ہے انسان سے کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی بہشت میں بسبب تقصیر
ہو جانے کے بہشتی پوشاک اُن کی اُتاری گئی۔ اور ننگے رہ گئے۔ تو گھبرا کر جس درخت
کے نزدیک گئے۔ کہ اُس کے پتے لیکر اپنا تن ڈھانکیں وہ درخت اُونچا ہو گیا۔
اور پتے ان کو نہ دئے۔ اور جب انجیر کے درخت کے پاس گئے۔ تو یہ اُونچا نہ ہوا
تب انہوں نے اس کے پتے بہت سے توڑ کر اپنی شرمگاہ کو چھپایا اور بعضے
کسان لوگ یعنے کھیتی کرنے والے کہتے ہیں کہ کامل جھاڑ وہ ہے کہ جس میں
دس چیزیں موجود ہوں جڑ اور ڈالیاں اور پتے اور پھول اور میوہ اور گٹھلی
اور گوند اور چھال اور چھلکا اور شیرہ جیسے کھجور کا درخت کہ یہ دسوں چیزیں اس
میں موجود ہیں۔ اور جس درخت میں ان دس چیزوں سے کم ہوویں وہ درخت ناقص
ہے۔ پس انجیر گٹھلی نہیں رکھتا ہے۔ تو چاہئے کہ وہ ناقص ہو جواب اس کا یہ
ہے۔ کہ یہ نقصان عین کمال ہے کیونکہ گٹھلی کچھ کھانے کی چیز نہیں ہے پھینک

دینے کی چیز ہے۔ پس ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔ حاصل کلام کا یہ ہے کہ جناب
باری نے اس کی جمعیت پر یعنے سب میووں کی خوبیاں اس میں موجود ہیں اور
فوائد پاور بے ضرری پر نظر فرما کر اُس کی قسم کھائی ہے۔ اور اس کی مناسبت
کو جو انسان کی جامعیت کے ساتھ رکھتا ہے رعایت فرمائی ہے وَالزَّیْتُوْنِ
اور قسم ہے زیتون کے درخت کی کہ پھل کو بھی اُس کے زیتون کہتے ہیں اور وہ
بھی جامع یعنی جمع کرنے والا ہے بہت سے فائدوں کو ظاہر میں بھی اور باطن میں
بھی پھر وہ جو ظاہر کے فائدے ہیں۔ اُن میں ایک یہ ہے۔ کہ جب پھل کو اُسکے
سرکے میں اچار بنا کر استعمال کرتے ہیں تو معدے کو قوت دیتا ہے اور بھوک
کو بڑھاتا ہے اور زیتون کا پختہ پھل کھانے سے بخوبی سیری حاصل ہوتی
ہے۔ اور بدن کو موٹا کرتا ہے۔ اور قوت باہ کو بڑھاتا ہے۔ اور اگر زیتون کی
گٹھلی کا مغز چربی اور آٹے میں ملا کو کوڑھی کے بدن پر ملیں تو کوڑھ دفع
ہوجاتا ہے۔ اور اگر زیتون کے شیرے کا عورت فرزجہ لیوے تو بچہ دان کا
بہنا موقوف کر دیتا ہے۔ اور جس نمک پانی میں کہ زیتون کے پھل ڈالے ہوں
اگر اُس کی کلی کریں تو دانتوں کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے اور جو کچھ کہ انجیر
میں فائدے جمع ہیں۔ کہ غذا بھی ہے اور میوہ بھی ہے اور دوا بھی ہے وہی
فائدے زیتون میں بھی موجود ہیں کچھ زیادتی کے ساتھ اور وہ فائدے یہ ہیں
کہ زیتون کا سالہا سال تک فائدہ باقی رہتا ہے۔ اس طور سے کہ جس قدر
کہ اس میں سے پکے جھڑتے ہیں اُس کا تیل بنتا ہے اور اُس کو زیت الانفاق
کہتے ہیں کہ قندیلوں اور چراغوں میں جلانے کے کام آتا ہے اور روشنی اسکی

نہایت صاف اور لطیف ہوتی ہے۔ کہ اور چیزوں کے تیل کی ویسی روشنی
نہیں ہوتی۔ اور جو پک جاتا ہے۔ تو اُس کا بھی تیل نکالتے ہیں۔ اُس کو
زینت الطیب کہتے ہیں۔ کہ خوشبودار ہوتا ہے۔ اور فائدہ بخشنے میں بےنظیر
ہے۔ اور قولنج کے دفع کرنے کے واسطے اور سُدّوں کے اور اسہال کے واسطے
خاصیت ارنڈی کے تیل کی رکھتا ہے اور ملنے میں اور لیپ کرنے میں روغن
گُل کے مانند ہے۔ اور شری اور جرب اور قوبا اور صداع اور بالوں کی سیاہی
اور درد نقرس اور وجع مفاصل اور سبل اور رطوبت غلیظ کو کہ ملکوں میں
پہنچتی ہے بہت مفید ہے۔ اور اگر بچھو کے کاٹے پر لگائے تو بہت فائدہ
کرتا ہے۔ اور جو خصوصیتیں کہ باطن میں ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے۔
کہ جب اس کا تیل بنتا ہے تو کمال نورانیت اور چمک پیدا کرتا ہے۔ اور
اس سبب سے یعنی باطنی خصوصیت سے کمال والوں کے ساتھ نہایت
مناسبت رکھتا ہے۔ کہ جب اپنے حیات کے پھل کو ریاضت کی گھریا
میں گلا کر روح کے لطیف کرنے میں کوشش اور جانفشانی کرکے نہایت
نرمی اور لطافت پیدا کرتے ہیں۔ تو بڑی نورانیت اور روشنی حاصل ہوتی
ہے۔ اور باوجود اس بات کے تیل اس کا دھوؤں کی سیاہی سے پاک
ہوتا ہے ارواح کاملہ کی نورانیت کے مانند بخلاف اور تیلوں کے کہ
باطل ریاضت کرنے والوں کی طرح سے ملے ہوئے دھوئیں کی سیاہی
سے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ فکر اور استدلال والوں سے کمال
مناسبت رکھتا ہے کہ معلومات کے احوال کو فکر کی قوت میں ڈال کر گلاتے

اور اوٹاتے ہیں تاکہ روشنی اور چمک پیدا کرے۔ اور چیزوں کی حقیقت
دریافت کرنے میں چراغ کی روشنی کی طرح کام میں لاویں۔ اور یہ بھی ہے
کہ کمال مناسبت رکھتا ہے قرآن کے لفظوں سے کہ جب اُس کے معنوں کو
لفظوں کی آمیزش سے علیحدہ کردیں۔ تو حقائق الٰہی کے نور کی تابش اور
روشنی دکھاتا ہے اور یہ بھی ہے کہ کوئی درخت دنیا میں اتنی بڑی عمر
نہیں رکھتا جتنی کہ یہ درخت رکھتا ہے کہ فلسطین جو ایک شہر مشہور ومعروف
ہے اقلیم شام میں وہاں زیتون کے جھاڑ یونانیوں کے ہاتھ کے لگائے
ہوئے اب تک موجود ہیں۔ کہ وہ لوگ سکندر کے زمانے میں اُس ملک کی
طرف آئے تھے۔ پس ہر درخت کی عمر اُن درختوں میں سے آج کی تاریخ تک
دو ہزار برس کے قریب ہوئی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ بہت پیدائش کی جگہ
اُس درخت کی شام کا ملک ہے کہ جگہ انبیاؤں اور اولیاؤں کے رہنے کی
ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس درخت کے لئے
برکت کی دعا کی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ قرآن مجید میں اُس درخت کا نام
شجرۂ مبارکہ فرمایا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ جو کوئی
اپنے کیخواب میں دیکھے کہ زیتون کے پتّے ہاتھ میں لئے ہے اُس کو خوشخبری
ہے کہ عُروۃ الوثقیٰ یعنے شریعت کی سیدھی راہ اُس کے ہاتھ آوے گی۔
اور ایک مریض نے ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ شیخ المعبّرین یعنے
سردار تعبیر کرنے والوں کے تھے آکر کہا کہ مجھ کو خواب میں بتایا ہے کہ دونوں کا
میں سے کھا ابن سیرینؒ نے کہا کہ زیتون کے پھل کھا کہ اُس کے حق میں

قرآن شریف میں لا شرقیۃ ولا غربیۃ وارد ہوا ہے اور حدیث شریف
میں ہے کہ کُلُوا مِنَ الزَّیتِ وَادَّهِنُوا بِہٖ فَاِنَّہٗ مِنْ شَجَرَۃٍ مُبَارَکَۃٍ۔
یعنی کھاؤ زیتون کا تیل اور بدن پر ملو اُس کو کہ وہ برکت والے درخت
کا تیل ہے۔ حاصل کلام کا یہ ہے کہ اس قسم میں ترقی واقع ہے پہلے
قسم کی نسبت سے یعنی پہلی قسم میں انجیر کو یاد فرمایا تھا۔ کہ ظاہری
فائدے رکھتا ہے بغیر باطن کی نورانیت کے۔ اور اس قسم میں زیتون
کو یاد فرمایا کہ ظاہری فائدوں کے ساتھ باطن کی نورانیت بھی رکھتا ہے
تو انسان کے کمال سے اُس کو مناسبت زیادہ ہے وَطُورِ سِینِینَ
اور قسم ہے جھاڑ والے پہاڑوں کی سمجھنا چاہیئے کہ طور لغت میں پہاڑ کو
کہتے ہیں اور پہاڑ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جھاڑ والے کہ اُن میں سے چشمے
جاری ہوتے ہیں اور بسبب اُس پانی کے طرح طرح کے جھاڑ اُن میں
اُگتے ہیں جیسے اخروٹ اور چلغوزے اور انجیر اور زیتون اور دوسرے
بڑے بڑے درخت جیسے سال اور ساگوان خودرو یعنے آپ ہی آپ
پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوائیں جیسے عقاقیر اور مصلح گرم جیسے لونگ
اور الائچی وغیرہ اور جدوار یعنے نربسی اور زہر اور لاکھوں بوٹیاں نقصان
کرنے والی اور فائدہ بخشنے والی نمودار ہوتی ہیں۔ اور جانور عجیب جیسے پہاڑی
بکرے نہایت بڑے بڑے اور ہرن جس میں سے مشک نکلتا ہے۔ اور
مرغ زرّین اور ان کے سوا اور بہت جانور عجیب وغریب وہاں پیدا ہوتے
ہیں۔ اور قسم سے معدنوں کی جیسے بلّور اور یشب اور بہت سی چیزیں اس

قسم کی اُس میں پیدا ہوتی ہیں۔ پس جامعیت ایسے پہاڑ کی نہایت عالی
مرتبے میں ہے کہ نباتات بھی اس میں موجود ہیں۔ اور حیوانات بھی اور
ارواح جناتی بھی مثل دیو پری کے ایسے پہاڑوں میں بہت ہوتی ہیں
اور اُن چیزوں کے فائدے کی امید پر بہت سے آدمی بھی وہاں رہتے
ہیں۔ پس ایسا پہاڑ کہ ایسے ایسے عجائبات کا مجمع ہو رہا ہے۔ کہ عشر عشیر
اُس کا کسی جا سے پر معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود جمعیت کے ہر
پہاڑ جھاڑ دار تجلی الٰہی سے خالی ہے۔ جب ایسے پہاڑ میں تجلی الٰہی بھی
حاصل ہوئی تو جامعیت کامل اُس کے واسطے حاصل ہوئی
سو اس قسم کا پہاڑ جھاڑوں والا ایک پہاڑ ہے مدین اور مصر کی
راہ میں کہ اس پہاڑ کو فلسطین کہتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و
علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس پہاڑ پر تجلی الٰہی نے سرفراز کیا۔ اور آواز
انی انا اللہ رب العالمین کی اُن کے کانوں میں پہنچائی اور کلیمی کا
مرتبہ اُس پہاڑ پر اُن کو حاصل ہوا اور بعد اس قصے کے بھی حضرت
موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جا کر اُس میں مناجاتیں
کی ہیں۔ اور چلے کھینچے ہیں اور عبادتیں کی ہیں اور توریت کی تختیاں
بھی جناب الٰہی سے اُسی پہاڑ پر ان کو عنایت ہوئی ہیں۔ پس وہ
پہاڑ باوجود ظاہر کی جامعیت کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے
روحی اسراروں کا اور اُن کی عبادت کے نوروں کا بھی جمع کرنے
والا ہوا اور جس نور اور اسرار نے کہ اس پہاڑ میں تجلی فرمائی تھی اور

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیہوش کیا تھا اسقدر اچھا اثر اُس کا مستقیم اور باقی
رہا۔ عَلٰی مَرِّ الدُّهُوْرِ وَالْاَزْمَانِ یعنی قرنوں اور زمانوں تک
ترتیب تسلسل کرنے کو حضرت موسیٰ ع کے فرمانبرداروں کے اور احکام
شرعی کو مدام ہونے میں کافی ہوا بس شروع اور انتہا انوار موسوی
کو تمام بنی اسرائیل اُس سے نورانی اور آراستہ ہوئے۔ وہی
مبارک پہاڑ تھا۔ اسی واسطے اس قسم میں پہلی قسم سے بھی ترقی
فرمائی کہ جو نور زیتون میں ہے وہ نور عنصری ہے اور جس نور نے
اس پہاڑ پر تجلی فرمائی اور اُس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا نور الٰہی تھا
ازلی لایزال ہمیشہ دائم یعنی قرنوں اور زمانوں تک اثر اُس کی باقی
رہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالات کے جھاڑ کو ابد الآباد
تک تر و تازہ رکھتا ہے۔ دوسرے خشک پہاڑ کہ اُن میں پانی نہ
جھاڑ تو وہ مُردے آدمی کے جسم کے مانند ہیں۔ کہ ظاہر میں آدمی
نظر آتا ہے اور باطن میں کوئی انسانی کیفیت نہیں رکھتا اس واسطے
قابل قسم کے نہ تھے۔ اس سے بچنے کے واسطے لفظ سینین کا فرمایا
ہر چند اصل لغت میں طور سینین ہریالی والے پہاڑ کو بولتے ہیں لیکن
عرف میں یہ لفظ خاص اسی پہاڑ کے واسطے ہے جس پر حضرت موسیٰ ع
کو تجلی الٰہی واقع ہوئی تھی۔ اور لفظ سینین کا نبط کی قوم کی لغت
ہے۔ کہ شام کی اقلیم کے کھیتی کرنے والے ہیں۔ اور اس لفظ کو عرب
کے لوگ کئی طرح تصرف سے استعمال کرتے ہیں کبھی سینین

کہتے ہیں۔ اور کبھی سینا سین کے زیر کے ساتھ چنانچہ پارۂ قد افلح میں واقع ہے اور کبھی سینا سین کے زیر کے ساتھ چنانچہ ابوعمرو اور نافع اور ابن کثیر پڑھتے ہیں اور بعضے مفسروں نے کہا ہے کہ مراد انجیر سے اصحاب کہف کی مسجد ہے کہ اُس کے گرد انجیر کے جھاڑ بہت ہیں۔ اور مراد زیتون سے بیت المقدس کی مسجد ہے کہ گرداگرد اُس کے یہ درخت کثرت سے ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ زیتون سے مراد زیتا کا پہاڑ ہے کہ وہ بیت المقدس سے مشرق کی طرف واقع ہے بلند ہے مسجد اقصےٰ سے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہ ازواج مطہرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہیں بیت المقدس کو تشریف لے گئیں۔ اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو مسجد سے نکلکر طور زیتا پر تشریف فرما ہوئیں اور وہاں پر بھی نماز پڑھی پھر اس پہاڑ کے کنارہ پر کھڑے ہو کر ارشاد کیا کہ اسی جگہ سے لوگ قیامت کے دن متفرق ہونگے۔ کچھ بہشت کو جاویں گے۔ اور کچھ دوزخ کو اور یہ وہی پہاڑ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کو یہاں سے آسمان پر لے گئے ہیں۔ اور اس مکان کی نصاریٰ بہت تعظیم کرتے تھے۔ اور کرتے ہیں اور اس پہاڑ کے سر پر ایک فرنگن نے (کہ اُس کا نام ہیلانہ تھا) ایک کنیسہ بنایا تھا۔ اور اُس کے اندر ایک قبّہ بنایا تھا کہ اس کو مصعد عیسیٰ علیہ السلام کا کہتے تھے۔ یعنے عیسیٰ علیہ السلام کے

چڑھنے کی جگہ ہوتے ہوتے وہ کنیسہ ڈھے گیا لیکن بالفعل اس پہاڑ
میں خرنوب نبطی کا درخت ہے کہ قریب اُس کے ایک مسجد بنائی ہے
اور اُس مسجد کی پائین میں ایک غار ہے صاف کہ بہت لوگ اُس
مکان کی زیارت کے واسطے جاتے ہیں اور اُس درخت کو خرنوبۃ العشرہ
کہتے ہیں اور جب سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس کو فرنگیوں
کے ہاتھ سے فتح کرلیا۔ تمام زمین طور زیتا کی شیخ احمد حکاری کو اور شیخ
علی حکاری کو برابر آدھوں آدھ تقسیم کرکے وقف کردی۔ اور یہ قصّہ
سترہویں ذیحجہ کو سال پانچ سو چراشی ۵۸۴ میں واقع ہُوا۔ اور وہ
زمین اب تک اُن دونوں شیخوں کی اولاد کے ہاتھ میں ہے پس اس
سورۃ میں اوّل اُس جگہ کی قسم کھائی۔ کہ اصحاب کہف کی ولایت
کے انوار کی جائے ہے۔ اور وہ لوگ پہلے گروہ ہیں اولیاؤں کے
کہ فناہ کی راہ چلے ہیں بعد اس کے انوار نبوت عیسوی کے جائے
کی قسم یاد فرمائی۔ بعد اس کے انوار موسوی کی جائے کی قسم
کھائی بعد اس کے فرماتے ہیں وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ اور اس شہر
امانت والے کی یا امن والے کی اور مراد اس شہر سے مکہ معظمہ کا
شہر ہے۔ کہ جامعیّت میں نہایت کو پہنچا ہے اس لئے کہ ہر شہر
قسم قسم کے لوگوں کو جیسے سپاہی اور سوداگر اور پیشے والے اور غنی
اور فقیر اور عورت اور مرد اور سوا اس کے اور قسم قسم کی چیزوں کو
جامع ہوتا ہے جیسے بادشاہ اور حاکم اور مکانات متبرکہ اور مقام

شہدا اور قبور اولیاء اور انبیاء کی اور عبادت خانے اور مسجدیں اُن میں ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کی بوٹیاں اور قسم قسم کے جانور پرند اور چرند اُس میں پرورش پاتے ہیں لیکن کسی شہر میں بیت اللہ یعنے خدا کا گھر کہ ہمیشہ تجلی الٰہی اُترنے کی جگہ ہو اور سب مخلوق کی عبادت کا قبلہ ہو نہیں ہے۔ مگر یہی ایک شہر یعنے مکہ معظمہ کہ یہ بزرگی بھی اُس کو نصیب ہوئی ہے اور اس سبب سے اُس کو جامعیت کامل حاصل ہوئی ہے اور ان سب وصفوں کے ساتھ پیدا ہونے اور نبی ہوتے خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی جائے ہے پس جامع ہے وحی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسرار کا اور اُس جناب کے نبوت اور ولایت کے نور اُس میں ظاہر اور تاباں ہیں اور وہ نبوت اور ولایت نہایت جامع دوسری نبوتوں اور ولایتوں سے ہے پس اس قسم میں بڑی ترقی ہوگئی جمعیت کی اگلی قسموں کے بہ نسبت گویا کہ یہ جمعیت ایسی جمعیت ہے۔ کہ سب عالم اسفل کے اور عالم اعلیٰ کے اسراروں کو اور بھیدوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے اور خالق اور خلق میں رلا ملا دیا ہے۔ اور شہر مکہ ایک شہر ہے لمبا کہ لمباؤ اُس کا زیادہ ہے چوڑاؤ سے اور پہاڑ گرداگرد اُس کے قلعے کے مانند واقع ہوئے ہیں۔ اور اُن پہاڑوں کے ہونے کے ساتھ بعضے طرف دیوار شہر پناہ کے طور پر بنائی ہے سو جو دیوار کہ مشرق کی طرف ہے وہ باب معلات کی دیوار کر کے مشہور ہے کہ مقبرۂ شریف اُس

شہر کا ہے اور وہ دیوار کہ مغرب کی طرف اور کچھ شمال کی طرف مقابل مدینۂ مقدسہ نبویہ کے ہے۔ اُس کو سور باب الشبیکہ کہتے ہیں اور جو دیوار کہ یمن کی طرف ہے۔ اُس کو سور باب الیمن اور سور باب الماجن بھی کہتے ہیں اور تعمیر ان دیواروں کی سنہ ۸۱۶ھ آٹھ سو سولہ میں حکم سے وہاں کے شریف کے کہ سید حسن بن عجلان تھا واقع ہوئی۔ اور طول اور عرض اُس شہر کا اس قدر ہے کہ باب معلات سے باب ماجن تک چار ہزار چار سو بہتر ۴۴۷۲ گز ہے اور باب معلات سے شبیکہ تک بھی اتنا ہی ہے مگر دو سو بیس ۲۲۰ گز زیادہ ہے اور گرداگرد اُس کے دو پہاڑ ہیں۔ ایک کو ابوقبیس کہتے ہیں اور دوسرے کو کہ وہ سنگ سرخ کا ہے مقابل ابوقبیس کے قعیقعان کہتے ہیں اور ان دونوں پہاڑوں کو اخشبین مکہ کہتے ہیں ابوقبیس کو اخشب شرقی اور قعیقعان کو اخشب غربی کہتے ہیں۔ اور مکہ معظمہ میں عمارتیں بہت ہیں اور بہتے چشمے اور چشمہ دار کوئیں اور وقفی حوض اور حمام بہت سے ہیں چنانچہ فاکہی کے زمانے میں کہ اس مقام کا مؤرخ ہی سولہ حمام گرم ہوتے تھے۔ اور اس شہر کو دو قسم ٹھہرایا ہے ایک معلات ایک مسفلہ اور ایک دار الخیزران کہ نزدیک کوہ صفا کے داہنی طرف مکہ معظمہ کی حد سے معلات کی ہے اور دار العجلہ کہ بائیں طرف مکہ معظمہ کے ہے نشانی حد مسفلہ کی ہے اور یہ شہر مکرم اور معظم حجاز کی ولایت میں داخل ہے اور وہ ولایت درمیان میں ولایت شام اور عراق اور مصر اور یمن کے واقع ہے اور اس ولایت میں کئی شہر داخل ہیں چنانچہ ایک اُن میں سے یہی شہر ہے اور ایک

مدینہ منورہ اور ایک یمامہ اور بہت پرگنے ان تینوں شہروں کے ساتھ تعلق
رکھتے ہیں اور عمل مکہ معظمہ کا بعضی طرف سے دس منزل ہے خصوصاً جو
سرحد کہ یمن کی طرف واقع ہے اُس کو ضنکان کہتے ہیں وہ مکہ معظمہ سے
دس روز کی راہ ہے۔ اور بعضی طرف سے کم ہے جیسے مدینہ مکرمہ کی طرف
کہ سرحد اس طرف کی ایک گاؤں ہے کہ اُس کو جنازہ بن صیفی کہتے ہیں
اور ایک گاؤں ہے درمیان عسفان اور مکہ کے ڈیڑھ منزل پر ہے اور
عراق کی طرف ایک گاؤں ہے۔ کہ اُس کو عمیر کہتے ہیں وہ بھی اسی قدر
ہے اور گرداگرد مکہ معظمہ کے حد حرم کی ہے۔ کہ وہاں شکار کرنا اور درخت
کاٹنا درست نہیں ہے۔ اور اگر اتفاقاً کسی نے وہاں شکار مارا یا جھاڑ کاٹا
تو اُس پر کفارہ آتا ہے۔ اور حد حرم کی دروازے سے مسجد الحرام کے
کہ مشہور باب بنی شیبہ ہے۔ دو مینار دن تک کہ عرفے کی طرف حرم کی
حد پر کھڑے ہیں سینتیس ہزار دو سو دس گز ہے۔ اور باب معلات سے
اُن ہی دونوں میناروں تک پینتیس ہزار تراسی گز ہے۔ اور عراق
کی طرف اُن دونوں میناروں تک کہ راہ پر وادی نخلہ کے بنائے ہیں۔
ستائیس ہزار ایک سو باون گز ہے۔ اور باب معلات سے اُن ہی دونوں
میناروں تک پچیس ہزار پچیس گز ہے اور تنعیم کی طرف سے کہ مدینہ منورہ کی
سمت کو واقع ہے حد حرم کی بارہ ہزار چار سو بیس گز ہے اور یمن کی طرف
سے دیوار سے باب ابراہیم کی حرم کی حد کے نشان تک چوبیس ہزار پانچسو نو گز ہے
ہے اور دیوار سے باب الماجن کی حرم کی حد کے علامت تک اُسی طرف کو کہ وہ

بھی یمن کی طرف ہے بائیس ہزار آٹھ سو چھہتر ۲۲۸۷۶ گز ہے اور حساب کی رو سے
حرم کے دور کو سینتالیس ۴۷ کوس لکھا ہے واللہ اعلم اور خصوصیات سے
حرم کے وے ہیں جو مذکور ہوئے یعنی شکاری جانوروں کا نہ وہاں شکار کرنا
درست ہے اور نہ سایا اور پانی سے ہانکنا اور نہ درخت اور سبزہ وہاں
کا کاٹنا اور اکھیڑنا اور نہ پتے جھاڑنا یہ سب جائز نہیں مگر اذخر اور سنا
کہ دوا کی ضرورت کے واسطے جائز رکھا ہے اور یہ بھی ہے کہ اس جگہ
آدمی ارادہ کرنے سے گناہ کے پکڑا جاتا ہے سوائے اور مکانوں کے اور
عبادت اور بندگی وہاں کی بہت ثواب رکھتی ہے۔ چنانچہ حسن بصری
رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک روزہ مکہ معظمہ کا برابر لاکھ روزوں
کے ہے اور ایک درم دینا اس مکان مبارک میں برابر لاکھ درم کے ہے
اور حاکم کی مستدرک میں ابن عباس رض سے نقل کی ہے حَسَنَاتُ الْحَرَمِ
کُلُّ حَسَنَةٍ بِمِائَةِ اَلْفِ حَسَنَةٍ یعنی ہر نیکی کہ حرم میں کی جاتی ہے برابر
لاکھ نیکی کے ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ جو کوئی مکہ معظمہ میں مرے گا شرف
اور بزرگی اس کو حاصل ہوگی۔ چنانچہ حدیث شریف میں واقع ہے کہ
مَنْ مَاتَ بِمَكَّةَ بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى الْاٰمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنے جو مرا مکے
میں اٹھاویگا اسکو اللہ تعالےٰ قیامت کو امن والوں میں اور یہ بھی حدیث شریف
میں ابن عمر رض سے واقع ہے کہ مَنْ مَاتَ بِمَكَّةَ فَكَاَنَّمَا مَاتَ فِى السَّمَآءِ
الدُّنْيَا یعنی جو کوئی مرا مکہ معظمہ میں تو گویا کہ مرا دنیا کے آسمان پر اور نشانیاں
عجیب غریب وہاں نظر آتی ہیں کہ اگر درندہ جیسے بھیڑیا یا چیتا کسی جانور

کے پیچھے دوڑتا ہے اور وہ جانور جب حرم کی حد میں داخل ہوجاتا ہے تو وہ درندہ پھر جاتا ہے اور ہرگز حرم میں داخل نہیں ہوتا اور بہت لوگوں نے حرم کی حد میں ہرنوں کو اور درندے جانوروں کو ایک جگہ ملے دیکھا ہے اور یہ بھی ہے کہ پرندے جب اُڑتے ہوئے بیت اللہ کے قریب آتے ہیں تو کچھ ادھر کچھ اُدھر پھٹ جاتے ہیں اور کعبے کے اوپر ہوکر نہیں جاتے یہ بات ہمیشہ لوگ دیکھتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ پانی زمزم کے کوئیں کا شب برات کو جوش کرتا ہے اور یہ بھی ہے کہ زمزم کے پانی میں ایک خاصیت ہے کہ اسکے پینے سے سیری حاصل ہوتی ہے جیسے کھانا کھانے سے حاصل کلام کا یہ ہے کہ یہ شہر مبارک بسبب کمال جامعیت کے نہایت عالی مرتبے کو پہنچا ہے اسی واسطے اس سورۃ میں اسی شہر کی قسم پر ختم فرماکر مطلب کو ارشاد کرتے ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یعنی قسم ان چاروں چیزونکی اس بات پر ہے کہ مقرر ہم نے پیدا کیا انسان کو بہت اچھی صورت اور ترکیب میں اس واسطے کہ اگر ظاہر اُسکا دیکھیے تو کمال حسن اور جمال کے ساتھ موصوف ہے قد اور قامت میں اور دوسرا اندام کی خوبی اور برابری میں گردن اُسکی نہ ایسی لمبی ہے اونٹ کی سی نہ بہت چھوٹی ہے کچھوے کی سی ناک اُسکی نہ ایسی لمبی جیسے ہاتھی کی سونڈ نہ اور چوپایوں کی طرح بے معلوم اسی طرح سب اعضا میں غور کیا چاہیے اور خوبی اور حسن اور جمال دریافت کیا چاہیے اسی واسطے امام شافعی رح کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی عورت سے کہا تھا کہ ان لم تکونی احسن من القمر فانت طالق یعنے اگر تو چاند سے اچھی ہوگی تو تجھ کو میں نے طلاق دی سب علما اُس وقت کے حیران ہوئے اور طلاق پڑنے کا حکم دیا جب یہ استفتا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا فرمایا کہ طلاق واقع نہیں ہوتی اسواسطے کہ اسکی عورت انسان

ہے اور انسان کو حق جل و علا نے فرمایا ہے کہ میں نے اچھی صورت میں اُس کو بنایا ہے اگر چاند کی صورت اُس سے اچھی ہوتی تو احسن تقویم اُس کی تعریف میں کیوں فرماتا۔ ولنعم ما قیل۔ اشعار۔ ما انت ما دحھا من یشبھھا + بالشمس البدر لا بل انت ھاجیھا + من این للشمس خال فوق وجنتھا + ومضحک من نظام الدر فی فیھا + من این للبدر اجفان مکحلۃ + بالسحر والفتح یجری فی حواشیھا + یعنی نہیں ہے تو تعریف کرنیوالا اے وہ شخص جو تشبیہ دیتا ہے انسان کو آفتاب اور ماہتاب سے بلکہ تو ہجو کرنیوالا ہے اُس کا کہاں ہے آفتاب کے تل رخسارے پر اور ہنسنے میں لڑی موتیوں کی مُنہ میں اُس کے کہاں ہے۔ چاند کی پلکیں سُرمہ والیاں جادو بھری اور فتح اور نصرت جاری ہے کناروں میں اُس کے اور ظاہر بات ہے کہ چاند میں سوائے روشنی اور چمک کے کچھ اور نہیں ہے۔ اور یہ نسخہ جامع ہے نقاشی کی نزاکتوں کا اور طرح طرح کی شکلوں کا چنانچہ کہا گیا ہے شعر۔ من ماہ ندیدہ ام کلہ دار۔ من سرو ندیدہ ام قبا پوش۔ یعنی میں نے چاند نہیں دیکھا ٹوپی دیئے ہوئے اور سرو کو نہیں دیکھا میں نے قبا پہنے ہوئے۔ اور اس سبب سے بھی ہے کہ کوئی صورت دنیا میں لائق عبادتوں کثیرہ کے نہیں ہے جیسے آدمی کی صورت ہے کہ قیام اور رکوع اور سجود سب اُس سے ہو سکتا ہے اور اگر اُسکے حسن کا بیان تفصیل کے ساتھ کیا جاوے۔ جیسا کہ علم تشریح میں بیان ہے تو اُسکو دفتر کے دفتر چاہئیں اس واسطے اس بیان سے خاموش ہونا اور زبان قلم کو روک رکھنا بہتر ہے۔ اور اگر اُس کے باطن کے معنے کو غور کریں تو چار عالم اس نسخۂ جامعہ میں لپٹتے ہیں عالم شہوت کا اور عالم غضب کا اور عالم وہم کا اور عالم

خیال کا اور ان چاروں عالم کو غیبی حاکم کے حکم کا مسخر اور فرمانبردار کیا ہے۔ اور
اس حاکم کو شرع کی نورانی مشعل سے آنکھوں کی روشنائی بخشی کہ بھلے اور
برے کو اس نور سے پہچان لے پھر جب حکم اس حاکم کا ان چاروں عالم پر غالب
ہوتا ہے تو آدمی بڑے مرتبے کے کمال اور جامعیت کو پہنچتا ہے اور جو چیز کہ
کسی سے عالم متفرق میں اس کے حاصل ہونے کی توقع نہیں ہوتی ہے اس
اس نسخۂ جامعہ سے کہ انسان ہے حاصل ہوتی ہے جیسے معجون مرکب
کی خاصیت کہ کسی جزو میں اس کے اجزاؤں سے وہ خاصیت حاصل
نہیں ہوتی لیکن غلبہ اس حاکم کا محض غیبی مدد اور آسمانی توفیق سے
ہوتا ہے۔ اسی واسطے ہر کسی کو میسر نہیں ہوتا چنانچہ فرماتے ہیں ثُمَّ رَدَدْنٰهُ
پھر ڈال دیا ہم نے ایسی عجیب مخلوق کو جس کو اس قدر نوازا تھا اس کے
قصور کرنے سے عقل کے اور اس کی دوسری رعایا جیسے شہوت اور غصہ
اور وہم اور خیال کے کارخانے کے انتظام میں اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۙ نیچے
سے نیچے کہ چوپایوں کے مرتبے سے بھی گذر جاتا ہے اور شہوت اور غصے کے
جال میں ایسا پھنس جاتا ہے اور پھندے ہیں وہم اور خیال کے ایسا
بندھ جاتا ہے اس کا مرتبہ سب نکمی اور ذلیل مخلوقوں سے بھی زیادہ ذلیل
ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ دوسری مخلوقات کو جو کمالات حاصل کرنے کی استعداد
نہیں ہے تو پکڑ اور مار دھاڑ بھی نہیں ہے۔ اور اس مخلوق کو باوجود کمالات
حاصل کرنے کی استعداد کے اگر کمالوں سے محروم اور بے نصیب رہا تو
ہمیشگی کی پکڑ اور سدا رہنے والا عذاب درپیش ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

مگر جو لوگ ایمان لائے اور اپنی عقل کو اپنے وہم اور خیال پر غالب کیا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
اور کام کئے اچھے اور اپنی عقل کو شہوت اور غصے پر غالب کیا اور بہت محنت اور
کوشش کی فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۵ پھر ان کو مزدوری ہے بے انتہا اگرچہ ظاہر میں
کوشش ان کی بیماری اور بڑھاپے اور موت کے سبب سے تمام ہو جاتی
ہے لیکن جو کیفیت کہ اُن کی روح میں بسبب خوف جم جانے جوڑ بند کے
نیکوئی پر حاصل ہوئی ہے ہر روز زیادتی میں ہے اور ہر آن اور ہر لحظہ بے نہایت
ثواب مقابلے میں اُس کے بڑھتے جاوینگے چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے
کہ جو مسلمان بندہ اچھے دین کے چلن اور طریق پر ہوتا ہے اور وہ طریقہ اُس سے
بڑھاپے یا مسافری یا بیماری کے سبب سے چھوٹ جاوے حق تعالیٰ کاتب
الحسنات یعنی نیکی کے لکھنے والے فرشتوں کو فرماتا ہے کہ نامۂ اعمال میں اُس شخص
کے ثواب اُن طاعتوں اور نیکیوں کا کہ ہمیشہ کرتا تھا لکھدو اور اُس کا ثواب
اُس سے روکو مت بلکہ بعضی روایتوں میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد اُس کے
فرشتوں کو حکم کرینگے کہ اُس کی قبر کے پاس تسبیح اور تکبیر اور تحمید سے مشغول ہو
اور وہ سب اس بندے کے نام لکھو یہانتک کہ قیامت کے دن جب قبر سے
اُٹھے تو ان بے انتہا خزانوں کو خرچ میں لاوے اور بعضے مفسروں نے ثُمَّ
رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۵ کی آیت کو بڑھاپے اور سٹھیا جانے کی حالت پر
قیاس کیا ہے کہ اس حالت میں آدمی کی صورت بدل جاتی ہے اور جوڑ
بند ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور پیٹھ جھک کر کمان سی ہو جاتی ہے اور سیدھا پن
قد کا برباد ہو جاتا ہے اور سارا بدن اور سر کے بال سفید ہو کر مبروص یعنی سفید

داغ والے کی صورت بنجاتا ہے۔ اور جھریاں اُسکے چہرے پر پڑجاتی ہیں تو اس کا
چہرہ بدزیب معلوم ہوتا ہے۔ اور دانت اُکھڑ کر منہ کھنڈر کی صورت
بن جاتا ہے۔ لیکن ان معنوں کو استثنا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
کے مناسب نہیں ہے مگر جبکہ استثنا کو منقطع کہیں سو اُس میں بڑا تکلف
ہے اور جو ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت دین کی غالب کرنا عقل کا ہے
تمام قوتوں پر جیسے شہوت اور غصہ اور وہم اور خیال اور عقل کو نور سے شرع
کے روشن کرنا پس دین کی تکذیب کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہی اس واسطے
کہ انسان کی معنوی خوبصورتی عین دین ہے۔ اور وہ حُسن ہر کسی کو مطلوب
اور مرغوب ہے۔ اسی واسطے اس تکذیب کے رد کے مقام پر فرماتے ہیں فَمَا
یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ پھر کونسی چیز تیرے جھٹلانے کا باعث ہوتی ہے
اے آدمی باوجود ظاہر ہونے ایسے ایسے دین کے مقدمات کے جو اوپر بیان ہوچکے
حاصل یہ کہ جو حقیقت اپنی صورت معنوی کی معلوم کرلی تونے اور جان لیا کہ حُسن اس
صورت معنوی کا موقوف اس بات پر ہے۔ کہ اوّل عقل کو شرع کے نور سے
روشن کرکے پھر اُس کو اپنی قوتوں پر حاکم کرے پس کوئی وجہ دین کی تکذیب
کی باقی نہ رہے کیونکہ وہ نور دین ہی کا ہے جس سے عقل راہ پاتی ہے اس
واسطے کہ عقل مانند بینائی کے ہے۔ اور نور دین کا جیسے آفتاب کی شعاع
پھر اگر شعاع آفتاب کے درمیان میں نہ ہو تو بینائی سے اُس کی کچھ کام
نہیں نکلتا پس دین کا نور انسان کی صورت معنوی کے کمال حاصل
کرنے کے واسطے ضروریات سے ہے اور جس طرح کہ انسان خلل

پڑجانے سے ظاہر کی صورت میں انسانیت سے نکل جاتا ہے۔ اور
حیوانوں کے مانند مسخ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے صورت معنوی میں
خلل پڑجانے سے اُس حد سے نکل جاتا ہے اور مسخ معنوی میں گرفتار
ہو جاتا ہے اور ایسا کون نادان ہے کہ نکل جانے کو انسانیت سے
او . . داخل ہونے کو حیوانیت میں اپنے اوپر روا رکھے۔ اور اگر مزاج کے
فسا د کی راہ سے کوئی شخص حیوانی صورت کی طرف رغبت کرے تو اُس
کو . . . مقدمے سے سمجھا دینا چاہیئے۔ کہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ۵
کیا نہیں ہے اللہ سب حاکموں کا حاکم اور جو دوسرے حاکم اپنی رعیت کیواسطے یہ بات
نہیں چاہتے ہیں۔ کہ ایک فرقے سے دوسرے فرقے میں جا ملیں یا
اعلیٰ مرتبے سے ادنیٰ کی طرف جھکیں۔ تو حق تعالیٰ کیونکر ایسی حرکت
پسند کریگا۔ کہ حکمت کے خلاف ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین کو جزا
کے معنوں میں لیں۔ تو اس صورت میں ربط ان آیتوں اور اگلی آیتوں
کا یوں سمجھا چاہیئے۔ کہ جب قدرت حق تعالیٰ کی احوال بدل کرنے پر انسان
کی خلقت کے شروع سے (نطفہ تھا)۔ یہاں تک کہ خلقت میں کمال اعتدال
کو اور صورت کی خوبی کو پہنچا۔ اور زینت معنوی عقل کے دینے سے اور
روشن کرنے سے اُس کے شرع کے نور سے بھی اس کو بخشی پھر لیکا یک
بعضوں کو ان میں ایسا ظاہر میں گرا دیا کہ سب ذلیلوں کا ذلیل ہونا آدمی
پر کھل گیا۔ پھر جزا دینا قیامت کے دن اور مُردوں کا زندہ کرنا اور
احوال کا بدلنا کہ دنیا کے سرکشوں کو ذلیل کر دینا اور یہاں کے عاجزوں

کا مرتبہ بلند کر دینا اُس کے نزدیک کیا بعید ہے اور اس قدر کہ
بیان کیا گیا ثابت ہونے کو جزا کے باعتبار حق تعالیٰ کی قدرت
کے بس ہے اور اگر نظر اُس کی حکمت اور عدالت پر کریں اور
معلوم کر لیں۔ کہ بدلہ نیک کا اور بد کا پہنچانا اور فرق بد کار
اور نیکو کار میں کرنا حکمت اور عدالت کے واسطے واجب ہے
پس واجب ہونا جزا کا ثابت ہوا چنانچہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ
الْحَاکِمِیْنَ ۝ میں اشارہ اِسی بات کی طرف ہے۔ اب جاننا چاہیئے
کہ جزا کا ہونا باعتبار قدرت کے ممکن ہے اور حکمت اور عدالت کی
راہ سے واجب ہے۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو کوئی سورۂ
والتین کو پڑھے۔ اور اس آیت پر پہنچے۔ کہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ
الْحَاکِمِیْنَ ۝ تو چاہیئے کہ کہے بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ
یعنی سچ ہے کہ تو سب حاکموں کا حاکم ہے۔ اور میں بھی اس بات پر
گواہ ہوں اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے عشا کی نماز میں اس سورۃ کو اکثر پڑھا ہے۔ اور حضرت
امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی اکثر اس سورۃ کو
کعبے کے سامنے فرض نماز میں پڑھتے تھے۔ کہ اشارہ ہووے
حرم کی بزرگی پر کہ اس کی اس سورۃ میں قسم کھائی ہے۔ واللہ
اعلم بالصواب ۝